”راہِ رواں“ کا فکری و فنی جائزہ

مقالہ برائے ایم۔ فل (اردو)

مقالہ نگار:

مہناز بیگم

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

ستمبر ۲۰۱۸ء

"راہ رواں" کا فکری و فنی جائزہ

مقالہ نگار:

مہناز بیگم

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لئے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگو یجز

(اردو زبان وادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

ستمبر ۲۰۱۸ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے۔ وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگو یجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **"راہ رواں" کا فکری وفنی جائزہ**

پیش کار: مہناز بیگم رجسٹریشن نمبر: **110\MPhil/Urdu/F15**

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: زبان وادب اردو

ڈاکٹر صائمہ نذیر ______________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان ______________________

ڈین فیکلٹی آف لینگو یجز

بریگیڈیئر محمد ابراہیم ______________________

ڈائریکٹر جنرل

____

تاریخ

اقرار نامہ

میں، مہناز بیگم حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر صائمہ نذیر کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

____

مہناز بیگم

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

ستمبر ۲۰۱۸ء

فہرست ابواب

مقالہ کا دائرہ کار

بانو قدسیہ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں اُن کی مختلف ادبی جہات ہیں بطور افسانہ نگار اور ناول نگار انہیں مختلف حوالوں سے موضوع تحقیق بنایا گیا ہے ۔ لیکن اس مقالے میں بانو قدسیہ کی ایک نئ ادبی جہت کو متعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے ۔ بانو قدسیہ نے اپنے شوہر اشفاق احمد کی سوانح عمری لکھ کر خود کو بطور سوانح نگار متعارف کرایا ہے۔ اُن کی یہ تحریر سوانح کے فن پر اس حد تک پوری اترتی ہے اس حوالے سے اس تصنیف کا فکری اور فنی تجزیہ زیر نظر مقالے کا موضوع ہے۔ مقالے کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

مقالے کا پہلا باب سوانح نگاری کا فن اور روایت پر مشتمل ہے ۔ مقالے کا دوسرا باب ''راہ رواں'' کا فکری مطالعہ ہے۔ اس باب میں '' راہ رواں'' کا فکری حوالے سے تجزیہ کیا گیا ہے مقالے کا تیسرا باب ''راہ رواں''کا فنی مطالعہ ہے۔ اس باب میں "راہِ رواں" کا فنی حوالے سے تجزیہ کیا گیا ہے کہ یہ تصنیف سوانح نگاری کے فن کے مطابق ہے کہ نہیں۔ مقالے کا چوتھا باب مجموعی جائزہ اور نتائج پر مشتمل ہے۔

ABSTRACT

Banu Qudsia is a renowned literary figure in the literary circles. She is a versatile writer. Her dramas, novels, and short stories have been topics of research from different aspects of theirs. Research work is done on her biography and personality too. However, she, for the very first time, presented herself as a biographer. She wrote a biography, Rah e Rawan, a biographical account of her late husband, the renowned writer, Ashfaq Ahmad, and got herself acclaimed as a biographer too. The dissertation at hand is a research work to determine the position of Banu Qudsia as a biographer by critically and technically appreciating her book, Rah e Rawan.

The dissertation is divided into four chapters: Chapter one is an introduction to the art of biography and its tradition; chapter two analyzes the book, Rah e Rawan, critically; chapter three analyzes the book on technical grounds; and fourth, the last chapter is all about overview of the book and results derived by the researcher of this dissertation.

مقالہ کا مقصد

بانو قدسیہ بطور افسانہ نگار، ناول نگار اور ڈراما نگار اپنی ایک منفرد پہچان رکھتی ہیں۔ بانو قدسیہ پر اس حوالے سے متعدد تحقیقی کام ہو چکے ہیں لیکن " راہ رواں " میں بانو قدسیہ کی ایک نئی ادبی جہت سامنے آتی ہے۔ بانو قدسیہ افسانہ نگار، ناول نگاراور ڈراما نگار کی حیثیت سے ایک خاص مقام رکھتی ہیں لیکن سوانح نگار کی حیثیت سے وہ پہلی مرتبہ ادبی منظر نامے پر جلوہ گر ہوئی ہیں۔" راہ رواں "بانو قدسیہ کی آخری تصانیف میں سے ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے شوہر اشفاق احمد کی سوانح تحریر کی ہے۔

بانو قدسیہ بطور سوانح نگار متعارف کرانااور ان کی لکھی گئی اس سوانح کا تجزیہ کرنا اس مقالے کا بنیادی مقصد ہے۔ اس مقالے سے نہ صرف بانو قدسیہ کی ایک نئی ادبی جہت سامنے آئے گی بلکہ ادب کے قاری یہ جان سکیں گے کہ بانو قدسیہ بطور سوانح نگار کس ادبی مقام کی حامل ہیں نیز " راہ رواں "سوانح نگاری کے فن پر کس حد تک پوری اُترتی ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں ان تمام امور کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

اظہار تشکر

اللہ تعالیٰ کی ذات کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے جس ذات نے مجھے ہر مشکل گھڑی میں سرخرو کیا ہے۔ میرے مقالے کی تکمیل بھی اُس پاک ذات کی مہربانی سے ہوئی ہے اور اس مہربانی پر میں اللہ پاک کی بے حد شکر گزار ہوں۔

مقالے کا موضوع ایک مشکل ترین مرحلہ تھا ایسے میں میری نگران مقالہ نے میری دلچسپی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مجھے سوانحی ادب کے حوالے سے " راہ رواں" کا فکری اور فنی جائزہ جیسے موضوع کا انتخاب کرنے میں رہنمائی فرمائی۔ مجھے ابتدا ہی سے نثر میں دلچسپی رہی اور سوانحی ادب اس حوالے سے دلچسپ ہوتا ہے کہ اس میں آپ کسی شخصیت سے مکمل آگاہی حاصل کر سکتے ہیں اسی سوچ کے تحت میں نے اس موضوع کا انتخاب کیا اور اللہ تعالیٰ کی شکر گزار ہوں کہ میرا مقالہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔

اس مقالے کو مکمل کرنے میں جن شخصیات کا تعاون اور رہنمائی میرے ساتھ رہی ان کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے سب سے پہلے اپنے والدین کی شکر گزار ہوں جنھوں نے ہر مرحلے پر میرے لیے آسانیاں پیدا کیں اور اپنی والدہ محترمہ کی شکر گزار ہوں جنہوں نے دن رات میرے لیے دعائیں کیں۔ اللہ تعالیٰ میری والدہ کو صحت والی لمبی زندگی عطا کرے۔ نویدہ کوثر کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جس نے مواد کی جمع آوری میں میری مدد کی۔ ڈاکٹر اقلیمہ ناز کی بھی مشکور ہیں جنھوں نے میری بھرپور رہنمائی کی۔

مہناز بیگم

اسکالر ایم فل اُردو

باب اول:

سوانح نگاری کا فن اور روایت

ا۔ سوانح نگاری کی تعریف:۔

سوانح نگاری صنف نثر ہے اس صنف نثر میں کسی فرد کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات وواقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ انگریزی میں سوانح عمری کے مترادف کے طور پر لفظ" Biography "استعمال ہوتا ہے۔ اردو زبان میں لغوی اعتبار سے سوانح عمری کے مترادف کے طور لفظ" سیرت اور تذکرہ" بھی استعمال ہوتی ہیں۔ سوانح لکھنے والے کو اردو میں سوانح نگار کہا جاتا ہے اور انگریزی میں اس کے مترادف کے طور پر لفظ "Biographer "استعمال ہوتا ہے۔ سوانح عمری کے مطلب کو واضح کرنے کے لیے مختلف لغات سے اس کے معنی درج کیے جاتے ہیں۔

فیروز اللغات میں سوانح عمری کا مطلب اس طرح بیان ہوا ہے:

"(ع۔ا۔مث) کسی شخص کی زندگی کے حالات۔ تذکرہ۔"[1]

کسی شخص کی زندگی کے حالات وواقعات کا بیان سوانح عمری کہلاتا ہے۔ اس صنف میں کسی فرد کی زندگی کے کارناموں، واقعات وحالات اور حادثات کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

اُردو لغت کے مطابق:

"سوانح[ن] (ع، مذکر) سانحہ کی جمع واقعات۔
سوانح عمری(مونث) زندگی کے حالات۔"(۲)

سوانح میں کوئی شخص کسی مخصوص فرد کی زندگی کی داستان تحریر کرتا ہے۔ وہ اس فرد کی زندگی کے تمام خارجی اور داخلی پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے اور ان کا تذکرہ اپنے مخصوص انداز میں بیان میں کرتا ہے۔ سوانح نگار ایک فرد کی زندگی کی مکمل تصویر کشی کرتا ہے۔ اسی وجہ سے سوانح عمری کو ایک شخص کی تاریخ بھی کہہ سکتے ہیں۔ سوانح نگار ایک مخصوص شخصیت کی زندگی کے کارناموں اور واقعات و حادثات کو ترتیب سے بیان کرتا ہے۔

صدف نقوی اپنی کتاب "گوہر ادب" میں سوانح کی تعریف ایسے کرتی ہیں۔

"سوانح عمری، انگریزی کے لفظ Biography کے مترادف ہے اصلاح میں اس صنف نثر کو کہتے ہیں جس میں کسی فرد کے حالات زندگی اور شخصی کارنامے اس کی پیدائش سے لے کر وفات تک بیان کیے جائیں۔"(۳)

سوانح عمری کے لیے کسی بھی خاص شخص کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ پیغمبر خدا، ولی اللہ، آئمہ دین، شاعر وادیب، جنگجو، رہنما اور لیڈر جیسی کوئی بھی شخصیت اس صنف کا موضوع بن سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی عام غیر معروف اور معمولی شخص بھی سوانح عمری کا موضوع ہو سکتا ہے۔ سوانح عمری ایک ایسی صنف ہے جس میں تمام تحریری و غیر تحریری مواد کو بروئے کار لاتے ہوئے کسی فرد واحد کی داستان حیات ضبط تحریر میں لائی جاتی ہے۔ انجمن کی اردو۔ انگریزی لغت میں سوانح کے معنی اس طرح تحریر کیے گئے ہیں۔

"Sawanih Umri, w.f سوانح عمری;The incidents of one's of one's life; a biography."[۴]

سوانح عمری میں ناول کی طرح وسعت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے اور یہ تاریخ کی طرح سبق آموز بھی ہوتی ہے کیونکہ قاری ہیرو کی شخصیت کے کارناموں سے سبق حاصل کرتا ہے کہ ایک شخصیت نے کون سے کارنامے سرانجام دیئے اور کیسے دیئے وہ ان سب کارناموں کی تفصیل جان کر لطف اندوز بھی ہوتا ہے اور اس سے سبق بھی حاصل کرتا ہے۔ وہ ہیرو کی غلطیوں اور کمزوریوں سے بھی سبق سیکھتا ہے۔ سوانح نگار دراصل کسی شخص کی پوری زندگی کی تصویر قاری کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ سوانح نگار ہیرو کی زندگی کے کارناموں اور حالات کا تحقیقی جائزہ لینے کے بعد شخصیت کی مکمل تصویر کشی کرتا ہے۔

"سوانح (ع) مذکر، مونث؟(سانحہ کی جمع)!روئے داد، واقعات، (۲) حادثات، عمری، مذکر، مونث: سرگزشت، کسی شخص کی زندگی کا حال، نگار: (ف): واقعہ نگار، اخبار نویس، سوانح لکھنے والا۔"[۵]

فرہنگ ادبیات کے مطابق:

"فرہنگ ادبیات اردو میں سوانح عمری کے معنی کسی ایک شخص کی زندگی کے کوائف وحالات کا تذکرہ۔"[۶]

سوانح عمری کسی شخص کی پیدائش "خاندان" تعلیم وتربیت اور زندگی کے مشاغل کا تذکرہ ہی نہیں بلکہ اس صنف نثر میں ایک فرد کی نفسیاتی کیفیات عادات واطوار ظاہر وباطن کی سچی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ سوانح نگار ایک فرد کی پوری زندگی کی داستان تحریر کرتا ہے۔ اس صنف میں ہیرو کے عہد کے معاشی ومعاشرتی حالات کے ساتھ

ساتھ سیاسی حالات کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے تا کہ ہیرو کی شخصیت کے تمام پہلو نکھر کر سامنے آسکیں۔ سوانح عمری ایک فرد کی زندگی کے نشیب و فراز کی داستان ہوتی ہے۔

رفیع الدین ہاشمی کے بقول:

> ''سوانح عمری در اصل مقالہ نویسی کی ایک شکل ہے یہ کوئی مستقل اور الگ صنف نثر نہیں باعتبار موضوع مقالہ کی ایک قسم ہے۔ سوانح عمری وہ صنف ادب ہے جس میں کسی فرد کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے تمام واقعات، اس کی ذہنی و عقلی نشو و نما نشو و نما کے مختلف مراحل اور اس کے شخصی کارناموں وغیرہ کو بہ تفصیل بیان کیا جائے۔''(۷)

سوانح عمری میں دستیاب مواد کو استعمال میں لاتے ہوئے حقائق کا بیان ہوتا ہے۔ سوانح نگار ان حقائق کے بیان میں اپنی تمام تخیلاتی اور تخلیقی صلاحیتوں کو استعمال میں لاتے ہوئے اسے تحریر کرتا ہے۔

مظہر مہدی کے بقول:

> ''کسی فرد واحد کی زندگی کو کسی دوسرے شخص کے ذریعے معرض تحریر میں لانا سوانح نگاری ہے۔''(۸)

سوانح عمری میں فرد واحد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی پیش کش اس انداز میں کی جاتی ہے کہ اس فرد کی تمام خوبیاں اور خامیاں قاری کے سامنے آجاتی ہیں۔ سوانح نگار ایک فرد کی شخصیت کی مکمل تشکیل کرتا ہے۔ وہ اس کی زندگی کا جائزہ لیتا ہے اور مواد کو تحقیقی و تنقیدی کسوٹی سے گزارنے کے بعد شخصیت کی تعمیر کرتا ہے اور ایک مکمل شخصیت کو قارئین کے سامنے پیش کرنے کی سعی کرتا۔ سوانح عمری میں صرف ایک شخص کے حیات سفر کی داستان ہی بیان نہیں کی جاتی بلکہ اس کی شخصیت اخلاق و کردار کی مکمل تصویر کشی کی جاتی ہے۔ تا کہ قارئین اس

شخصیت کی زندگی میں آنے والے نشیب و فراز سے آگاہ ہو سکیں۔ سوانح دراصل ایک شخص کی مکمل اور سچی تصویر کشی کا نام ہے۔ سوانح نگار ایک فرد کی سچی تصویر کشی کے لیے اپنی تمام علمی و ادبی اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔

ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہین کے بقول:

"سوانح نگاری افراد کی تفسیر حیات یا تاریخ زیست ہے لیکن نہ مخصوص تاریخ ہے جس میں کارنامہ ہائے حیات سے زیادہ ذہن کے مختلف گوشوں کا وہ تدریجی ارتقا جس سے مل کر شخصیت وجود میں آئی پیش کیا جاتا ہے۔"(۹)

سوانح عمری میں ایک فرد کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا بیان ملتا ہے۔ سوانح نگار ہیرو کی زندگی اور شخصیت کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو غیر جانب داری سے بیان کرتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند کے بقول:

"اس میں کسی شخص کے حالات زندگی اور شخصیت کے بارے میں لکھا جاتا ہے۔ یہ ایک مختصر مضمون بھی ہو سکتا ہے پوری کتاب بھی۔"(۱۰)

سوانح عمری میں کسی شخص کی صحیح اور سچی سیرت کشی کی جاتی ہے۔ سوانح نگار ہیرو کی زندگی کے سفر کی عکاسی بڑے موثر اور دلکش انداز میں کرتا ہے۔ کیونکہ یہ صنف ہے ہی سفر حیات کی عکاسی کا نام۔ اس صنف میں مصنف اپنے ہیرو کی داستان حیات تحریر کرتا ہے۔ سوانح نگار داستان حیات لکھتے ہوئے ان تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتا ہے جو شخصیت کی تعمیر اور اس کی مکمل تصویر پیش کرنے میں مدد دے سکیں۔

الطاف فاطمہ کے بقول:

''سوانح نگاری کسی فرد واحد کی شخصیت کو منظر عام پر اس طرح لانے کا نام ہے کہ اس کی فطرت اور سیرت کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ رہے۔''(۱۱)

سوانح عمری میں صرف ہیرو کی زندگی کے کارنامے ہی نہیں گنوائے جاتے بلکہ اس صنف میں اس کے ذہنی ارتقا سوچ رویوں اور وہ عناصر جن سے مل کر اس کی شخصیت بنتی ہے ان سب کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے تو سوانح کو کسی شخصیت کے سفر زندگی کی تاریخ تصور کیا جاتا ہے۔ سوانح لکھنا ایک مشکل کام ہے۔ اس صنف ادب میں پہلے موضوع کا انتخاب کیا جاتا ہے کہ کون سی شخصیت پر سوانح لکھی ہے پھر اسی حوالے سے مواد کو اکٹھا کرنا بہت محنت طلب اور صبر آزما کام ہے۔ پھر حدود کا تعین بھی کرنا ہوتا ہے۔ مواد کی چھان بین کر کے اسے عمدگی سے پیش کرنا سوانح نگار کا کام ہے۔ یہ ایک کٹھن مرحلہ ہے۔

وہاج الدین علوی کے بقول:

''سوانح حیات ادب کی وہ صنف ہے جو کسی خاص فرد کی زندگی کا عکس پیدائش سے موت تک پیش کرتی ہے اس کی تمام کامیابیوں اور ناکامیوں نیز اس کی زندگی کے اہم واقعات اور نفیاتی کیفیات کو دلچسپ ادبی انداز میں اجاگر کرتی ہے۔''(۱۲)

سترہویں صدی کے نصف آخر میں تقریباً سوانح کو ایک باقاعدہ صنف کا درجہ ملا۔ ڈرائیڈن نے پہلی بار لفظ سوانح عمری کی تعریف بیان کی ہے۔ سوانح نگار فرد کی پیدائش سے موت تک کے داخلی و خارجی حالات و واقعات جذبات و احساسات کو بیان کرتا ہے۔ حالات و واقعات کے بیان میں سوانح نگار کو حقائق سے آنکھیں نہیں چرانی چاہیں۔ وہ حقائق کا بیان ایک تخلیقی فنکار کی طرح بڑے دلکش انداز میں کرے۔ دوسری اصناف کی طرح اس صنف

میں بھی تمام ادبی تقاضوں کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ وہی سوانح عمری بہترین اور کامیاب تصور ہوتی ہے جس کے مواد اسلوب اور موضوع میں ہم آہنگی ہو۔ سوانح میں کسی فرد کی زندگی کا تاریخی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ تاریخی مطالعہ اسی وجہ سے کیونکہ اس میں ہیرو کی زندگی کے حالات وواقعات اور کارناموں کو تاریخی لحاظ سے ترتیب دیا جاتا ہے۔

> ''ادب کی دنیا میں حیات، سوانح، سوانح عمری یا لائف سے مراد ہے عصر، نسل اور ماحول جیسے مؤثرات کے حوالے سے کسی شخص کی داخلی اور خارجی زندگی کے تمام پہلوؤں کا ایسا جامع، مفصل اور معروضی مطالعہ، جو اس کی زندگی کے ارتقاء اور اس کے ظاہر و باطن کو روشنی میں لا کر اس کی ایک ایسی قد آدم اور جیتی جاگتی تصویر پیش کر سکے جس پر کسی اور کی تصویر ہونے کا مطلق گمان نہ گزرے۔''(۱۳)

سوانح عمری کی مختلف تعریفوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوانح وہ صنف ہے جس میں سوانح نگار اپنے ہیرو کی فطرت اور سیرت کے تمام پہلوؤں کو احاطے تحریر میں لاتا ہے۔ سوانح نگار کسی مخصوص شخصیت کے حالات زندگی کو بڑی غیر جانب داری سے پیش کرتا ہے۔ سیاسی رہنماؤں اور مذہبی شخصیات کی سوانح عمریاں اس لیے لکھی جاتی ہیں تاکہ پڑھنے والے اس فن سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ ہیرو کی زندگی سے سبق بھی حاصل کریں اور مذہبی رہنماؤں کی سیرت کو اپنا کر اپنی زندگی سنوار سکیں۔ اوپر بیان ہونے والی تعریفات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ صنف ہے جس میں کسی فرد کی حیات سفر کی مکمل تصویر کشی کی جاتی ہے۔ اور ان واقعات اور کارناموں کا انتخاب کیا جاتا ہے جو قارئین کے لیے کشش کا باعث ہوں سوانح نگار کو کسی شخص کی کہانی بیان کرتے ہوئے پُرکشش اور متاثر کن اسلوب اپنانا چاہیے کیونکہ اسلوب تحریر کا آئینہ ہوتا ہے۔

سوانح عمری اور آپ بیتی میں فرق:۔

سوانح عمری کے مطلب کو واضح کرنے کے لیے سوانح عمری اور آپ بیتی میں فرق جان لینا ضروری ہے تاکہ ان دونوں اصناف میں پائی جانے والی مماثلتوں اور فرق کو بیان کر کے سوانح کے مطلب کو واضح کیا جا سکے۔ جب کسی عظیم اور اہم شخصیت کے حالاتِ زندگی اور حادثات زندگی کو اکٹھا کر کے یک جان کر کے پیش کیا جاتا ہے دونوں میں سب سے پہلا اور بنیادی فرق یہ ہے کہ سوانح عمری کوئی دوسرا لکھتا ہے اور آپ بیتی خود تحریر کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ سوانح عمری عموماً وفات کے بعد ہی لکھی جاتی ہے جبکہ آپ بیتی مصنف اپنی زندگی میں ہی لکھ لیتا ہے۔ تو سوانح وجود میں آتی ہے۔ سوانح عمری کسی فرد واحد کی پیدائش سے لے کر موت تک کے حالات و واقعات کی پیش کش کا نام ہے اور یہ پیش کش اس انداز میں کی جاتی ہے کہ اس شخصیت کے تمام پہلو ابھر کر سامنے آجائیں۔ اس کی خوبیاں اور خامیاں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ سوانح نگار ہیرو کی ظاہری و باطنی تمام کیفیات کا بیان کرتا ہے۔ سوانح عمری اور آپ بیتی دونوں اصناف میں ہی کسی شخص کے سفر حیات کے متعلق معلومات ملتی ہیں۔ آپ بیتی میں ایک فرد صرف اپنی زندگی کے حالات و واقعات اور حادثات کا تذکرہ کرتا ہے وہ اپنے زاویہ نگاہ سے اپنے احوال بیان کرتا ہے۔ جبکہ سوانح عمری میں ایک فرد کسی دوسرے فرد کے حالاتِ زندگی قلم بند کرتا ہے۔

ڈاکٹر وہاج الدین علوی آپ بیتی کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ”خود نوشت سوانح حیات ادب کی وہ تخلیقی صنف ہے جو کسی فرد واحد کی زندگی کے ادوار پر محیط ہوتی ہے اور اس کے قلم کی مرہونِ منت ہوتی ہے جس کے آئینہ میں اس فرد کی داخلی اور خارجی زندگی کا عکس براہ راست نظر آتا ہے اور اس کا عہد بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔“[۱۴]

آپ بیتی کے لیے انگریزی میں لفظAuto-biographyمترادف کے طور پر برتا جاتا ہے۔ سوانح عمری میں کوئی شخص کسی دوسرے فرد کے سفر حیات کے متعلق تحریر کرتا ہے۔ وہ اپنی پوری کوشش سے دیانت داری سے اس فرد کی داستان کو بیان کرتا ہے۔ وہ بطور مورخ اور مصور کام کرتا ہے۔ وہ واقعات و حالات کو پرکھنے کے بعد حقائق کو قابل فہم اور موثر انداز میں پیش کرتا ہے۔ آپ بیتی میں مصنف کی اپنی ذات مرکزی کردار ہوتی ہے۔ وہ خود اپنا ہیرو ہوتا ہے جبکہ سوانح عمری میں مرکزی کردار مصنف کی منتخب کردہ شخصیت ہوتی ہے۔ یہی شخصیت اس کا ہیرو ہوتی ہے۔

سوانح عمری میں مواد بہت اہمیت رکھتا ہے جس شخصیت کی سوانح لکھی جاتی ہے اس سے متعلق سابقہ تمام مواد کو اکٹھا کر کے اس کی چھان بین کر کے تحریر کیا جاتا ہے۔ شخصیت کے بارے میں منظر عام پر آنے والی تمام کتب رسائل اور خطوط سے مدد لی جاتی ہے۔ یہ وہ تذکرے ہیں جو ہیرو کی زندگی اور فن پر پہلے لکھے گئے ہوں جبکہ آپ بیتی میں مواد کی ضرورت نہیں ہوتی آپ بیتی نگار اپنے حافظے کے بل بوتے اور یادداشت سے پوری عمارت تیار کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی ذات کا سب سے بڑا واقف کار خود ہوتا ہے۔

کسی بھی سوانح عمری کو حرف آخر نہیں کہا جا سکتا کیونکہ نیا مواد دستیاب ہونے کی صورت میں مصنف خود اپنی تحریر میں تبدیلیاں لا سکتا ہے۔ اس صنف میں نظر ثانی کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔ مگر اس کے برعکس آپ بیتی حرف آخر تصور ہوتی ہے۔ اس میں تبدیلی کا امکان کافی کم ہوتا ہے۔ سوانحی فن نے آپ بیتی / خودنوشت سے پہلے جنم لیا۔

ڈاکٹر صبیحہ انور کے بقول:

"یہ بات کم و بیش مسلمہ ہے کہ دنیا میں دوسروں کی سوانح حیات پہلے لکھی گئیں اپنی کہانی اپنے قلم سے لکھنے کے فن نے بعد میں جنم لیا۔ اوّل الذکر میں قدامت کی وجہ سے بڑا ذخیرہ محدود ہے دونوں کو ہمجولی سمجھنے کا رجحان عام ہے۔ اس لیے کئی جگہوں پر جہاں سوانح عمری کا بیان ہوتا ہے وہاں ضمناً خود نوشت کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے۔ دونوں میں مماثلت کم اور مغائرت زیادہ ہے۔"(۱۵)

سوانح عمری میں ہر لکھنے والے کا اپنا اپنا انداز نظر اور زاویہ نگاہ ہوتا ہے وہ اپنے ہیرو کے بارے میں اپنے زاویہ نگاہ بیان کرتا ہے اس لیے ایک ہی شخصیت پر لکھی جانے والی سوانح عمریاں مختلف انداز نظر کی حامل ہوتی ہیں۔ ہر ایک نے اپنی مرضی کے واقعات اور کارناموں کا انتخاب کر کے اس کو اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ جبکہ آپ بیتی میں مصنف اپنی ذات کے بارے میں اپنے زاویہ نگاہ کو بیان کرتا ہے۔ جو کہ شاید کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔ آپ بیتی زندگی میں ایک بار لکھی جاتی ہے۔

سوانح عمری میں سوانح نگار کا اپنے ہیرو کی شخصیت سے مکمل واقفیت اور آگاہی ہونا ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ کیونکہ حالات واقعات کے بیان کے لیے اس شخصیت سے ذاتی وابستگی ہونا ضروری ہے۔ جبکہ آپ بیتی میں لکھنے والا اپنی ذات کے بارے میں لکھتا ہے اور وہ اپنے آپ سے آگاہ ہوتا ہے۔ سوانح عمری میں مصنف کو چاہیے کہ وہ مستند مواد یعنی خطوط یادداشتیں تصانیف اور تقریروں سے مدد لیتے ہوئے ان واقعات کو بیان کرے یا ان کا انتخاب کرے جو مستند ہوں۔ مستند مواد کا انتخاب سوانح نگاری کا لازمی حصہ ہے۔ اسی طرح آپ بیتی میں بھی مصنف کو واقعات کی صحت کا خیال رکھنا چاہیے۔ روزنامچے اور خطوط سے مدد لیتے ہوئے مستند واقعات کو بیان کرنا چاہیے۔ مصنف کو مبالغہ آرائی سے پرہیز کرنا چاہیے اور متوازن انداز بیان اپنانا چاہیے۔ تاکہ تحریر میں اثر پذیری پیدا

ہو سکے۔ اپنی زبان اپنے حالات بیان کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ جانب داری کا خدشہ ہوتا ہے۔ اپنے قلم سے اپنے سفر حیات کی کہانی بیان کرنا مشکل کام ہے۔ مصنف کے لیے انکشاف ذات کا سچا اظہار انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذات کا مثبت پہلو تو با آسانی پیش کر دیتا ہے۔ مگر منفی پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے وہ ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے۔ جبکہ سوانح نگار اپنے ہیرو کی ذات کے دونوں پہلوؤں کو بیان کر دیتا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانکا میں لکھا ہے:

''خود نوشت سوانح نگاری کا سوانح نگاری سے بہت قریبی تعلق ہے یا یہ کہ خود نوشت سوانح نگاری سوانحی ادب کی ایک خاص شکل ہے۔ یہ (خود نوشت) ایک شخص کے حالات زندگی پر مشتمل ہوتی ہے جو اس نے خود قلم بند کیے ہوں اس لیے یہ پوری نہیں ہوتی۔''[۱۶]

سوانح نگاری اور خود نوشت سوانح نگاری کا تعلق خاصا گہرا ہے دونوں اصناف کی اپنی اپنی اہمیت ہے۔ جب خود نوشت سوانح نگاری کا آغاز ہوا تو اس وقت سوانحی فن کئی ارتقائی مراحل سے گزرتا ہوا عروج تک پہنچ چکا تھا۔ آپ بیتی کا فن سوانحی فن کے زیر اثر پروان چڑھا۔ آپ بیتی کے فن میں سوانحی فن سے اصولوں اور ضوابط کو اخذ کیا اور اپنایا۔ مگر سوانح نگار اور آپ بیتی نگار کا انداز بیان ایک دوسرے سے منفرد اور جدا ہوتا ہے۔ آپ بیتی نگار اپنے جذبات و احساسات اور حالات کو بیان کرنے میں آزاد ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدوں کو اپنے قلم سے بیان کر دیتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے مختلف گوشوں سے نقاب اتار کر ان کو بیان کر دیتا ہے۔ وہ اپنی کہانی اپنی زبانی سناتا جاتا ہے۔ جبکہ سوانح نگار ہیرو کے فراہم شدہ واقعات اور حالات کو اپنے انداز میں ترتیب دیتا ہے۔

آپ بیتی کے لیے سادہ سلیس انداز بیان زیادہ موثر ہوتا ہے۔ یہی اسلوب آپ بیتی میں دلچسپی کا عنصر پیدا کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ سوانح نگار کو متوازن لب و لہجہ اپنانا چاہیے اور اس کے انداز بیان میں

اعتدال ہونا چاہیے۔ اسے بے جا مداح سرائی اور قصیدہ نگاری سے گریز کرنی چاہیے۔ سوانح نگار کو غیر جانب دار غیر جذباتی اور مناسب انداز بیان اپنانا چاہیے۔ سوانح عمری کے فرق کو واضح کرنے کے لیے آپ بیتی اور سوانح نگاری میں چند فرق بیان کیے گئے ہیں۔ تاکہ سوانح عمری کے مطلب کو سمجھنے میں آسانی ہو اور اس کے معنی و مفاہیم واضح ہو سکیں۔ آپ بیتی کا مفہوم بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ سوانح کا مفہوم واضح ہو سکے۔ آپ بیتی اور سوانح عمری کے فن کا سرسری جائزہ پیش کر کے دراصل سوانح عمری کے فن کی انفرادیت ظاہر کی گئی ہے۔

تاریخ نگاری اور سوانح عمری میں فرق:۔

سوانح عمری میں عموماً کسی تاریخی شخصیت کے احوال کا بیان ہوتا ہے اور اس سے جڑے ہوئے کئی تاریخی واقعات کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض محقق اس کو تاریخ نگاری بھی کہتے ہیں۔ مگر تاریخ نگاری اور سوانح عمری میں خاصا فرق ہے۔ سوانح تو کسی شخصیت یا فرد کی لکھی جاتی ہے۔ جبکہ تاریخ میں واقعات کو تسلسل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

منصف خان سحاب کے بقول:

> ''تاریخ کی بنیاد انسانی واقعات ہیں جبکہ سوانح کی بنیاد صرف ایک انسان ہے۔ تاریخ کا موضوع کوئی ملک یا خاص دور ہے اور سوانح کا موضوع کوئی ایک شخصیت ہے۔ تاریخ کی حدیں ازل سے ابد تک ہیں اور لا محدود ہیں سوانح کی حدیں پیدائش سے موت تک محدود ہیں۔''[۱۷]

سوانح عمری میں ایک مخصوص فرد موضوع ہوتا ہے جبکہ تاریخ میں کسی خاص ملک یا کسی خاص دور کو موضوع بنایا جاتا ہے اور اس ملک اور اسی دور سے متعلقہ واقعات کا بیان ہوتا ہے۔ اگر کسی ملک کا بیان تاریخی ترتیب

سے کیا جاتا ہے اور اگر کسی دور کی تاریخ لکھی جا رہی ہے تو اس مخصوص دور سے متعلق واقعات اور حالات کو بیان کیا جاتا ہے۔ واقعات و حالات کے بیان میں تاریخی ترتیب اور تسلسل کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔

سوانح میں جس مخصوص شخصیت یا فرد کا انتخاب کیا جاتا ہے اسی سے متعلقہ مواد اور چند اہم واقعات جن کا براہ راست تعلق شخصیت سے ہے صرف ان کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ سوانح عمری میں شخصیت کی تصویر کشی اہم ہوتی ہے۔ سوانح عمری کی حدیں پیدائش سے موت تک پھیلی ہوئی اور محدود ہیں۔ جو صرف ایک شخصیت کے گرد گھومتی ہیں۔ جبکہ تاریخ نگاری کی حدیں لامحدود اور وسیع ہیں۔

ڈاکٹر سید شاہ علی کے بقول:

> ''مورخ انسانوں کا ایک دوربین کے ذریعے اور سوانح نگار منفرد آدمیوں کا ایک خوردبین کے تحت مشاہدہ کرتا ہے۔ تاریخ ہمیں سرکاری ایوانوں میں لے جاتی ہے۔ سوانح عمری نجی قیام گاہوں میں تاریخ میں ایک فاتح کی سپاہیانہ صفت اہم ہوتی ہیں اور سوانح نگاری میں اسے بحیثیت انسان پیش کیا جاتا ہے۔''(۱۸)

سوانح نگاری میں مصنف اپنی پسندیدہ شخصیت کا انتخاب کرتا ہے اس میں جانب داری کا عنصر پایا جاتا ہے مگر تاریخ تعجب سے پاک اور غیر جانب داری سے کام لیتے ہوئے مرتب کی جاتی ہے۔ سوانح کو تاریخ کا ایک دلچسپ اور پرکشش روپ قرار دیا جاسکتا ہے مگر اس کو تاریخ نہیں کہا جاسکتا۔ تاریخ کا روپ اس لیے کیونکہ جس عہد کی شخصیت کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اس عہد کا بیان تو کسی نہ کسی صورت میں سوانح میں ضرور ہوتا ہے۔ سیاسی معاشی اور معاشرتی حالات و واقعات کا تذکرہ سوانح عمری کا حصہ ہوتا ہے۔ سوانح میں تاریخی واقعات کا بیان کسی نہ کسی نقطہ نظر سے ضرور نظر آتا ہے۔ تاریخ لکھتے ہوئے سوانح سے تاریخی مواد تو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ تاریخ لکھنے میں سوانح مددگار

ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی وجہ سے سوانح عمری کو تاریخ کا روپ کہا جاتا ہے۔ مگر تاریخ کو ایک فرد کی سوانح عمری قرار نہیں دیا جاسکتا۔ سوانح میں ایک مخصوص کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور تمام واقعات و حالات کی کڑیاں اسی کے گرد گھومتی اور اسی سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔

سوانح نگار بطور مورخ اور مصور اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ وہ بطور مصور تصویر سازی کا کام کرتا ہے اور ایسی تصویر سازی کرتا ہے کہ اصل شخص سے مشابہ بھی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بطور مورخ حالات و واقعات کی چھان بین کر کے حقائق پر مبنی واقعات کو بڑی دیانت داری سے ترتیب دینے کی کوشش کرتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالقیوم کے بقول:

> ''سوانح میں ایسے واقعات اور حالات ظاہر ہونے چاہیں جن میں آپس میں مطابقت اور تعلق اور جو ہمارے ذہنی اور دماغی رجحانات کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہو سکیں۔ سوانح میں اسی شخصی رشتے کی کارفرمائی ایک امتیازی بات ہے اور سوانح کو تاریخ سے یہی رشتہ علیحدہ کرتا ہے۔ مگر یہ تعلق تاریخ میں باقی نہیں رہتا۔''(۱۹)

تاریخ میں بڑے بڑے اور اہم واقعات بیان کیے جاتے ہیں جبکہ سوانح میں افراد کے نجی گھروندوں میں جھانکا جاسکتا ہے تاریخ نگاری اور سوانح نگاری میں واضح فرق ہے۔ سوانح عمری کو تاریخ نگاری کا ایک چھوٹا سا جزو تو قرار دیا جاسکتا ہے مگر تاریخ نہیں۔ جس شخصیت کی سوانح عمری لکھی جارہی ہو وہ سوانح دراصل اس عہد کی تاریخ کی عکاس ہے۔ اور اس میں اپنے دور کی سیاسی کشمکش معاشی حالات اور معاشرتی واقعات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس اظہار کے بغیر سوانح پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ ہیرو جس ماحول میں پروان چڑھتا ہے اس کے اثرات اس کی پوری زندگی پر حاوی ہوتے ہیں ہیرو کی سچی سیرت کشی کے لیے اس عہد کے حالات و واقعات کو سمجھنا اشد ضروری ہے۔ عہد کو

سمجھنے کے بعد ہی شخصیت کی مکمل تصویر کشی ممکن ہو گی۔ سوانح نگار تاریخ نگار کی طرح واقعات و حادثات کی حقیقت کو آشکار کرتا ہے۔ تاریخ میں فاتح کی صفات کا بیان اہم ہوتا ہے مگر سوانح میں اس کی خوبیوں خامیوں کا تذکرہ کر کے اس کو بطور شخصیت پیش کیا جاتا ہے۔

سوانح عمری کی مختلف تعریفوں کو بیان کر کے اس کے معنی و مفاہیم کو واضح کیا گیا اب آگے یہ دیکھا جائے گا کہ اس فن کا آغاز و ارتقا کیسے ہوا اور یہ صنف کب وجود میں آئی اور اس نے کون کون سی ارتقائی منازل طے کی اور پروان چڑھی۔ لہٰذا سوانح نگاری کی روایت کا جائزہ لیا جائے گا۔

۲۔ اردو میں سوانح نگاری کی روایت:۔

سوانح نگاری کا آغاز قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ سب سے پہلے یہودیوں نے اس فن کی طرف توجہ کی اور اپنے قدما کے سفر حیات قلم بند کیے۔ اس کے بعد یونانی اس فن کی طرف متوجہ ہوئے۔ عربی اور فارسی میں سوانح عمری کے ابتدائی نمونے سیرت نگاری یا تذکرہ نویسی کی صورت میں موجود ہیں۔

اسلام سے پہلے شخصی سوانح عمریاں لکھنے کا رواج کم تھا اسلام پھیلنے کے بعد مسلمانوں نے اس طرف توجہ کی اور قرآن و حدیث کی تفسیر و تشریح کے سلسلے میں سوانح نگاری کی۔ ابتدا قرآنی قصوں سے ہوئی اور قرآن پاک میں بیان کیے جانے والے قصوں کو جو انبیاء سے متعلق تھے تحریر کیا گیا۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ کے حالات زندگی تحریر کیے گئے ان معتبر شخصیات کی زندگی کے مختلف پہلوؤں قرآن پاک میں موجود تھے۔ فارسی میں عربی کی مانند اصول و ضوابط اپنائے گئے فارسی میں سیرت نگاری کرتے ہوئے عربی سیرت نگاری کی تقلید کی گئی۔ کچھ سوانح تو فارسی میں عربی سے ترجمہ کی گئیں اور کچھ طبع زاد سوانح تحریر کی گئیں عربی سے متاثر ہو کر فارسی شعرا کے تذکرے بھی تحریر کیے گئے۔ ایرانی اسلام قبول کرنے کے بعد علم و ادب میں کافی آگے بڑھے اور دلچسپی لی

اور ترقی بھی کی۔ انہوں نے کوشش کر کے کئی شاہکار تصانیف تحریر کیں۔ فارسی میں تذکرہ نگاری کا آغاز سید الدین محمد بن عوفی نے کیا ان کا تذکرہ "لباب الالبا" بہت اہمیت کا حامل ہے۔

ایرانی مصنفین نے بیشتر افراد جماعتوں وزرا اور شعرا کے تذکرے لکھے اور تاریخی واقعات کو تاریخی ترتیب سے تحریر کیا۔ اس کی واضح مثال اس عہد کی کتاب "قصص الانبیاء" ہے جو ۱۹۷۳(۱۹۷۳) میں لکھی گئی۔ اس کتاب میں تقریباً ۱۵۰ علما کے حالات زندگی تحریر ہیں۔ فارسی شعرا کے تذکروں میں ان کے سوانح اور کلام کے نمونے ملتے ہیں۔ اس عہد کے تذکروں میں زیادہ شعرا کا کلام بیان ہوا ہے مختصراً حالات زندگی کا بیان بھی ملتا ہے۔

ڈاکٹر ممتاز فاخرہ کے بقول:

> "سوانح نگاری کے تدریجی ارتقا کا مطالعہ کیا جائے تو اس کے اجزا منظم نہ سہی لیکن منتشر طور پر تاریخوں تذکروں اور سیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ایسی تصانیف عموماً مذہبی اکابر کے حالات و ملفوظات پر مشتمل ہوتی تھیں۔ ملفوظات اور اولیائے کرام کے تذکروں کے ساتھ ساتھ حضرت عمر فاروقؓ نے سوانح نگاری کی طرف کافی توجہ دی آپ کے عہد میں اس فن یا صنف کا آغاز ہوا۔"[۲۰]

ابتدا میں لکھے گئے تذکرے یا مذھبی اکابرین کی سیرت نگاری کے پیچھے اُس شخصیت کے خصائص کی روشنی میں پڑھنے والوں کی تربیت اور رہنمائی کا مقصد کارفرما تھا یہی وجہ ہے کہ اس دور میں صرف ایسی شخصیات کو موضوع بنایا گیا جو معاشرے میں نمایاں مقام رکھتے تھے یا اُس شخصیت نے کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہو۔

ملک راشد فیصل کے بقول:

> "قرآنی احکام کی وضاحت کے لئے احادیث اور سیر یا مغازی کی تدوین کی ضرورت ہوتی تھی اور ان کی صحت کی پیش نظر رویوں کے کردار کی جانچ پرکھ ہوتی تھی۔۔۔۔۔ حضرت عمرؓ نے اس ضمن میں خاص توجہ دی۔ انہوں نے حکم دیا کہ غزوات نبوی کا خاص حلقہ درس قائم کیا جائے۔ اس زمانے میں امام زہری نے مغازی پر ایک مستقل کتاب لکھی جس کی وجہ سے سیرت کا عام مذاق پیدا ہو گیا بعض خاص اصول و معیار بھی مقرر کیے گئے۔"[۲۱]

اس طرح اس عہد میں تاریخ نویسی اور سیرت نگاری میں لمبی چھان بین اور تلاش کا رجحان پیدا ہونا شروع ہوا۔ اسلام پھیلنے سے پہلے صرف بادشاہوں کی سوانح عمریاں لکھی جاتی تھیں۔ اسلام آنے کے بعد موضوعات میں وسعت پیدا ہوئی بادشاہوں کے علاوہ خلفا وزرا سفیروں اور فوجی آفسروں کی سوانح بھی لکھی جانے لگیں۔ عربی زبان میں "سیرت رسولؐ" پر جو سوانح عمریاں لکھی گئیں وہ بہت متاثر کن ہیں سیرت نگار تمام جزئیات کے بیان میں روایتوں کی صحت کا مکمل خیال کرتے تھے۔ رسولؐ کی سیرت میں آپؐ کی زندگی کے تمام حالات و واقعات اور اندرون خانہ کے تمام احوال کتابوں میں دستیاب ہیں۔

عربی زبان کی طرح فارسی زبان میں بھی کئی تذکرے اور سیرت لکھی گئی فارسی کے ادب پر عربی کے اثرات نمایاں پائے جاتے روزنامچوں اور یادداشتوں میں بھی ابتدائی نقوش نظر آتے ہیں۔

مغرب میں سب سے پہلے سوانح نگار جنوزف فلیوس نے یہودیوں کی تاریخ لکھی اور حضرت موسیٰؑ کے سفر حیات کی داستان لکھ کر اس فن کا آغاز کیا۔ پلوٹارک نے زمانہ قدیم میں چند نامور شخصیات کی سوانح تحریر کیں اس کے بعد یورپ میں بادشاہوں کی سوانح لکھی جانے لگیں۔

''مغرب میں باقاعدہ طور پر سب سے پہلے پلوٹارک نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اشخاص کی اخلاقی سیرت اور شخصی کردار کو قلم بند کرنا چاہیے۔پہلی صدی کے آخر میں پلوٹارک نے دنیائے ادب میں Parallel livesپیش کی جس میں چھالیس یونانیوں اور وسیلوں کے حالات زندگی پیش کئے گئے ہیں۔''(۲۲)

۱۸، ۱۹اور ۲۰ ویں صدی میں انگریزی میں سوانح نگاری کا آغاز ہوا ڈاکٹر سمویل جانسن نے کئی انگریز شعرا کی سوانح تحریر کیں جو بہت مقبول ہوئیں مغرب ادب میں سوانح نگاروں نے جو بے باکانہ انداز اپنایا اور جس انداز سے اپنے ہیرو کے حالات زندگی تحریر کیے۔ مشرق میں اس بے باکی کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ مشرق میں ان شخصیات کے صرف ایسے حالات زندگی کو تحریر میں لایا جاتا ہے جس کے سامنے آنے سے لوگوں کے دلوں میں ان کے خلاف کوئی منفی جذبہ یا رائے پیدا نہ ہو۔

مثلاً مغرب میں جنسی بے راہ روی کو بیان کرنے میں زرا برابر جھجک محسوس نہیں کرتے کیونکہ اس معاشرے میں ایسی سماجی معاشرتی برائیاں عام ہیں۔ مگر اس کے برعکس مشرق میں ان سب پہلوؤں کا بیان گناہ تصور کیا جاتا ہے اور یہ فحاشی کے زمرے میں آتا ہے۔ مغربی نقاد ڈرائی ڈن نے اس فن کو نئے اور دلچسپ انداز میں پیش کرنے کی سعی کی اس نے سوانح عمری کے فنی تقاضوں اور اصولوں میں سب سے زیادہ اہمیت اسلوب کو دی۔

اردو ادب میں میں بھی سوانح نگاری کی روایت خاصی پرانی ہے۔ باقی اصناف ادب کی طرح سوانح نگاری میں بھی مغربی اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ فارسی ادب کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ آغاز میں لکھے جانے والے تذکروں میں فارسی تذکروں کی خصوصیات نمایاں نظر آتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلم فاتحوں اور فرماں رواؤں سے متعلق بعض ایسی کتب سامنے آتی ہیں جس میں سوانحی اثرات ملتے ہیں۔ ان کو باقاعدہ سوانح

عمریاں تو تسلیم نہیں کیا جاتا مگر ان میں سوانح مواد موجود ہے۔ ان تحریروں میں یادداشت روزنامچے اور آپ بیتی کے عنصر پائے جاتے ہیں۔ اردو نثر میں سوانح نگاری کی روایت کافی سست ہے ابتدا میں یہ صنف خصوصی توجہ سے محروم رہی۔

مگر باقی اصناف ادب کی طرح دکن کی سرزمین پر اس صنف کو بڑھنے کا موقع ملا۔ جس طرح باقی اصناف کے آغاز کا سہرا دکن کے سر ہے اسی طرح سوانح نگاری میں بھی وہ یہ سہرا اپنے سر پر ہی سجاتا ہے۔ دکن کی ابتدائی شاعری میں منظوم سوانح عمری کے آثار پائے جاتے ہیں۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کے شعرا اس حوالے سے کافی اہمیت رکھتے ہیں انہوں نے شخصیت نگاری پر خاصی توجہ دی۔ نصرتی نے ''علی نامہ'' لکھا اس سوانح میں نصرتی نے مختلف جنگوں کے واقعات میدان جنگ کے نقشوں فوجوں سپاہیوں کے کردار روز مرہ زندگی کے حالات و واقعات کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ اس کے بعد اپنی کتاب ''گلشن عشق'' میں بھی شاعر کے حالات زندگی کی داستان بیان کی۔ اپنے والد کی عادات و خصائل اپنے بچپن اور تعلیم و تربیت کا تذکرہ بھی کیا مثنویاں باقاعدہ سوانح عمریاں تو نہیں کہلا سکتی مگر ان میں سوانح نگاری کے کئی عنصر واضح نظر آتے ہیں۔

ملک راشد فیصل کے بقول:

> ''گیارہویں صدی ہجری یا سترہویں صدی عیسوی میں اردو زبان اس قابل ہو چکی تھی کہ وہ شخصیت نگاری اور سوانح نگاری کے مختلف عناصر کو مثنویوں اور دیگر منظوم صورتوں میں سمو دے۔''(۲۳)

نصرتی نے ''علی نامہ'' میں سلطان علی عادل شاہ کے سفر حیات کی داستان بیان کی۔ اسی طرح ''قطب مشتری'' میں بھی اس عہد کے بادشاہ کے حالات تاریخی واقعات روایات اور تہذیب و تمدن کی تفصیل بیان کی۔

لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ سوانح نگاری کے ابتدائی عنصر کی مثنویوں میں واضح ملتے ہیں۔ دکن کے بعد شمالی ہند میں لکھے جانے والے مرثیوں میں بھی سوانح نگاری کے چند نمونے ملتے ہیں۔ جو غیر شعوری طور پر تحریر میں ابھرتے ہیں۔ اس عہد میں غیر شعوری کوشش سے سوانح نگار کی داغ بیل ڈالی گئی۔

سیرت نگاری کے بعد اردو میں تذکرہ نگاری کی طرف توجہ دی جانے لگی ابتدائی تذکروں میں سوانحی عناصر نمایاں پائے جاتے ہیں۔ ۱۹صدی کے آغاز میں تذکرہ نگاری کی ابتدا ہو گی۔ مگر اس عہد میں تذکروں کی تعداد بہت کم تھی۔ اس عہد میں میر تقی میر نے اپنے تذکرے ''نکات الشعرا'' میں سیرت نگاری کے عمدہ نمونے پیش کیے۔ اس تذکرے میں میر تقی میر نے چند سیرتوں کے خاکے بڑے اختصار سے بیان کیے۔ یہ تذکرہ اس عہد کا سب سے اہم تذکرہ ہے۔ اس میں شعرا کے مختصر حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ ''تذکرہ شعرا اردو'' ''گلزار ابراہیم'' جس میں بہت سے شعرا کے حالات زندگی ملتے ہیں جیسے کئی تذکرے قابل ذکر ہیں۔

محمد حسین آزاد کا تذکرہ ''آب حیات'' اردو ادب کی تذکروں کی تاریخ میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ مصنف نے شعراء کی عمدہ تصویر کشی کی۔ اپنے جاندار اسلوب کی بدولت آزاد نے متعدد شعرا کے حالات زندگی بڑی تفصیل سے بیان کیے۔ تذکروں کے علاوہ اس عہد میں کئی تصانیف ایسی بھی ملتی ہیں جن میں سوانحی پہلو تو نظر آتے ہیں مگر ان کو باقاعدہ سوانح عمریاں تصور نہیں کیا جاسکتا۔

اردو میں جو ابتدائی تذکرے لکھے گئے ان پر فارسی زبان و ادب کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔ مصنفین اپنے یار دوستوں آشناؤں کی مداح سرائی بڑے کھلے دل سے کرتے ہیں۔ تذکرہ نگار اپنی مرضی کی شخصیت کا انتخاب کرتے اور کلام کے ساتھ حالات زندگی کا مختصراً تذکرہ کرتے جو حالات وواقعات لکھے جاتے ہیں واقعات کی صحت پر توجہ بہت کم دی جاتی تھی۔ ان تذکروں میں تمام تر کمزوریوں کے باوجود ادب میں کافی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ

انہیں تذکروں میں سوانح کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں جو بکھرے ہوئے اجزاء کی صورت میں ہیں۔ ان تذکروں میں اس عہد کی تاریخ تہذیب و تمدن معاشرت ماحول ادبی و علمی محفلوں مشاغل کی کئی تصویر پیش کی گئی ہیں۔ ان تذکروں میں بہت سا مفید مواد موجود ہے جو ادیب اور محقیق کے لیے کافی اہم ہے۔ تذکروں میں شخصیات کی ذاتی زندگی کے حوالے سے معلومات کافی کم ہوتی ہیں۔ کیونکہ اس میں واقعات و حالات کے بیان میں اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔

جدید سوانح نگاری کا آغاز حالی نے کیا اور اردو سوانح نگاری کو تذکروں سے چھٹکارہ دلوایا۔ سر سید احمد خان کے عہد سے پہلے کئی چھوٹی بڑی سوانح عمریاں لکھی جاچکی ہیں۔ بہر حال اردو سوانح نگاری میں اولیت کا سہرا حالی کے سر ہے۔ حالی اردو سوانح نگاری کو بلندی تک لے گئے۔ ان کی پہلی باقاعدہ سوانح عمری ''حیات سعدی'' ہے۔

رفیع الدین ہاشمی کے بقول:

> ''قدیم تذکروں میں شعرا اور علما کے مختصر حالات ملتے ہیں مگر اردو میں سب سے پہلے حالی نے سوانح عمری کی طرف توجہ دی۔ ان کی حیات سعدی ۱۸۸۳ء اردو میں جدید طرز کی پہلی سوانح عمری ہے۔''(۲۴)

''حیات سعدی'' شیخ سعدی کی سوانح عمری ہے۔ شیخ سعدی ایک عالم گیر شخصیت تھے۔ حالی اس شخصیت کا گرویدہ تھا۔ اس لیے اس نے اس شخصیت کو موضوع بنایا حالی نے اس مصلح کی زندگی کے واقعات اور کمالات کو اجاگر کرنے میں اپنی تمام توانائیاں صرف کیں۔ سعدی کے بارے میں مواد کم ہونے کی وجہ سے حالی کا انداز بیاں خشک اور دھیما ہے۔ اس سوانح عمری میں سعدی کے سفر حیات کی تفصیلات بہت کم ہیں تصانیف پر تبصرہ زیادہ کیا

گیا۔ تین حصوں میں اس سوانح کو تقسیم کیا گیا۔ پہلے حصے میں سوانحی خاکہ دوسرے حصے میں تصانیف پر تبصرہ اور آخر میں ماحول و حالات اور شاعروں کا تذکرہ کیا گیا:

ڈاکٹر عبد القیوم کے بقول:

> ''اردو ادب میں یہ پہلی باقاعدہ سوانح عمری ہے جو مشرقی تذکرہ نویسی سے ہٹ کر جدید سائنٹفک بنیادوں پر لکھی گئی ہے۔ گویا حالی نے اردو ادب میں سوانح نگاری کے فن کی داغ بیل بھی ڈالی اور اسے پروان بھی چڑھایا۔''(۲۵)

واقعات کی تحقیق اور چھان بین میں کچھ کمیاں ضرور رہ گئیں مگر سوانح نگاری کے فن میں یہ بہت اہمیت کی حامل ہے۔ ''یادگار غالب'' حالی کی دوسری سوانح عمری ہے جو اس نے مشہور شاعر مرزا غالب کے متعلق لکھی ہے۔ اس سوانح عمری میں وہی انداز بیان اپنایا گیا جو ''حیات سعدی'' میں اپنایا گیا تھا اس سوانح میں کئی صفحات کو محض حالات زندگی کے نذر کر دیا گیا۔ حالی نے واقعات کی چھان بین کی بجائے کارناموں کی وضاحت دینا ضروری خیال کیا ہے۔ حالی نے غالب کے شاعرانہ جوہر کو اجاگر کرنے میں اپنی تمام توانائیاں صرف کی۔ حالی نے جو ملا اس کو بغیر کسی چھان بین کے پیش کر دیا۔

ڈاکٹر ممتاز فاخرہ کے بقول:

> ''حالی نے اپنے ہیرو کے حالات جمع کرنے میں بڑی محنت کی ہے کیونکہ معاصرین کے حالات جابجا بکھرے ہوئے ہیں سوانح نگار کو ان کے مخالفین اور موافقین کا سامنا بھی کرنا ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے حالی نے صرف شاعرانہ شخصیت پر اظہار کو ضروری سمجھا۔''(۲۶)

حالی کا سوانحی فن بتدریج ارتقائی منازل طے کرتا نظر آتا ہے۔ ان کا سوانحی شعور ارتقائی مراحل سے گزرتا ہوا جب "حیات جاوید" تک پہنچا تو پوری طرح نکھر چکا تھا۔ حیات جاوید میں ان کا فن پوری طرح کھل کر سامنے آیا۔ اس موضوع میں حالی نے اپنے عہد کی عظیم شخصیت کے سفر حیات کی جھلک پیش کی۔ جس کا نام سرسید احمد خاں ہے۔ اس سوانح کو تحریر کرتے وقت انھوں نے اپنے ذہن میں تشکیل پانے والے باقاعدہ سوانح عمری کے تصور سے بھرپور استفادہ کیا۔ مغربی سوانح نگاری کے اصولوں سے بھی استفادہ کیا گیا حیات جاوید کو پہلی منظم سوانح عمری کہا جاتا ہے۔

انگریزوں نے عمائدین حکومت اور کلیسا وغیرہ کو موضوع بناتے ہوئے سوانح تحریر کی تھیں رفتہ رفتہ انقلاب رونما ہوا فن میں تبدیلی آئی اور عام انسانوں حکمرانوں سیاسی لیڈروں کے علاوہ ادیبوں اور مجرموں کی سوانح عمریاں بھی تحریر کی جانے لگی۔ مگر اردو ادب میں باقاعدہ سوانح عمری کا آغاز ادیبوں کی سوانح لکھ کر کیا گیا جیسے "حیات سعدی" "یادگار غالب" اور "حیات جاوید" اردو کی زندہ جاوید کتب شمار کی جاتی ہیں۔ "حیات جاوید" کو لکھنے تک حالی کے ذہن میں سوانح کا مخصوص تصور اپنی بنیادیں مضبوط کر چکا تھا۔ اس سوانح عمری میں حالی نے تمام دستیاب وسائل اور ذرائع کو بروئے کار لائے اور ہیرو کی زندگی سے متعلق تمام تفصیلات معلوم کی۔ مواد کے سلسلے میں رسائل وجرائد تنقیدی تحریر ہیرو کی ذاتی تحریر معاصرین کی تنقیدی تحریریں خطوط وغیرہ سے خوب استفادہ کیا۔ اس سوانح عمری کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا پہلے حصے میں حالات وواقعات تاریخ وار درج ہیں اور دوسرے حصے میں کارناموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ یہ کافی ضخیم کتاب ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے بقول:

''حیات جاوید اردو کے سوانحی ادب میں ایک صدی بعد آج بھی پہلے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ حقیقی معنوں میں اردو کی پہلی باضابطہ اور باقاعدہ سوانح عمری ''حیات جاوید'' ہے۔''[۲۷]

حیات جاوید حالی کی تیسری اورآخری منزلت ہے۔ حالی نے اس کتاب میں متوازن اور منصفانہ انداز نظر اپنایا انہوں نے اہم اور غیر اہم واقعات کے انتخاب میں بڑے سلیقے کا ثبوت دیا۔ حالی نے اپنے اس سلیقے کی بدولت سوانحی ادب میں اپنی شناخت بنائی اور ایک اہم سوانح نگار بن کر ابھرے سوانح کو با قاعدہ صنف کے طور پر حالی نے متعارف کروایا۔ حیات جاوید میں حالی نے سر سید کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر سفر زندگی کے تمام واقعات کو مفصل انداز میں بڑی فنی مہارت سے پیش کیا۔

ڈاکٹر سید اعجاز حسین کے بقول:

''اسلوب بیاں اور واقعات کی چھان بین کی وجہ سے ان کتابوں کی بدولت حالی کو اردو کے بہترین انشاپردازوں کے برابر جگہ ملی۔''[۲۸]

حالی کے بعد ان کے معاصرین میں ایک شخصیت نے سوانح نگاری کی طرف توجہ کی ان کا نام شبلی نعمانی ہے۔ شبلی نعمانی نے سوانح نگاری میں نئی آب و تاب پیدا کی اور کئی بلند پایہ سوانح تحریر کیں۔ شبلی نعمانی نے مشاہیر اسلام پر سوانح تحریر کیں۔ انہوں نے اس لیے ان شخصیات کا انتخاب کیا کیونکہ لوگوں کے دلوں میں ان شخصیات سے محبت پہلے سے موجود تھی۔ حضرت محمدؐ حضرت عمر فاروقؓ خلیہ مامون الرشید اور مولانا روم جیسی عظیم شخصیات پر

سوانح تحریر کیں۔ ان سوانح عمریوں کے بارے میں مواد اکٹھا کرنے میں سوانح نگار کو کافی مشکلات پیش آئیں۔ شبلی نے مذہبی اور تاریخی شخصیات کا انتخاب کیا۔

''المامون'' یہ شبلی کی تحریر کردہ پہلی سوانح عمری ہے جو علی گڑھ میں قیام کے دوران لکھی گئی اس سوانح کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے حصہ اول میں ماموں رشید پیدائش وفات تعلیم وتربیت فتوحات جیسے حالات کا بیان ملتا جبکہ دوسرے حصے میں مامون رشید کے سوانحی حالات وواقعات کا بیان ہے اور ساتھ ہی ملکی حالات کا تذکرہ بھی کیا گیا۔ شبلی نعمانی نے ایک خلیفہ کا مرقع بڑی دیانت داری سے پیش کیا۔ انہوں نے تاریخی واقعات اور شواہد کو اکٹھا کرنے میں بڑی محنت اور کاوش سے کام لیا۔ سوانح نگار نے ہیرو کے اوصاف کو بڑے دلکش اور متاثر کن انداز میں پیش کیا۔ اور ہیرو کی زندگی کے کارناموں کی سرگزشت لکھی۔ شبلی نے حالات وواقعات کا بیان اس انداز میں کیا کہ واقعات کا تسلسل بھی قائم رہے اور قاری کی دلچسپی بھی برابر برقرار رہے۔

ڈاکٹر ممتاز فاخرہ کے بقول:

> ''شبلی اچھے انشاپرداز ناقد مورخ شاعر اور محقق تسلیم کیے جاتے ہیں۔ بحیثیت سوانح نگار ان کے موضوعات کا دائرہ مذہبی اور تاریخی ہے ان کا مقصد تاریخ اسلام کے شاندار پہلوؤں کو قوم کے سامنے پیش کر کے احیائے جدید کو تقویت پہنچانا ہے۔''(۲۹)

''سیرۃ النعمان'' یہ شبلی نعمانی کی دوسری تصنیف اس کے بھی دو ہی حصے کیے گئے ہیں۔ پہلے حصے میں حالات زندگی اور دوسرے حصے میں کارناموں کی تفصیل درج ذیل ہے۔ شبلی نعمانی نے سوانح نگاری کے اصولوں اور تقاضوں کا پوری طرح خیال رکھا۔ یہ سوانح بھی ایک مذہبی وعلمی ہیرو امام ابو حنیفہ کی ہے بڑی تحقیق وتلاش سے کام لے کر سوانح نگار نے یہ سوانح ترتیب دی امام ابو حنیفہ کی بہت سی سوانح اب تک لکھی جا چکی ہیں مگر سیرۃ النعمان ان

کی سب سے اہم اور مفصل سوانح عمری ہے۔ شخصیت سے عقیدت و محبت ہونے کے باوجود سوانح نگار نے سوانح نگاری کے تمام تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی کتاب تحریر کی۔ اس میں ہیرو کی شخصیت کی تصویر کشی بڑی فنی مہارت سے کی گئی ہے۔

''الفاروق'' اس سوانح میں ایک اسلامی ہیرو اور مذہبی شخصیت حضرت عمر فاروق کی داستان حیات تحریر کی گئی ہے۔ سوانح نگار نے شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں جو واقعات اہم تھے ان کا انتخاب کیا اور انہیں بیان کیا۔ شخصیت کی تعمیر میں کردار بہت اہم ہوتا ہے شبلی نعمانی نے ایسے واقعات کو بیان کیا جو ہیرو کے کردار پر روشنی ڈالتے تھے۔ تاکہ ہیرو کی شخصیت کھل کر سامنے آسکے۔ اس سوانح میں شبلی نعمانی بطور سوانح نگار نکھر اور ابھر کر پوری طرح سامنے آئے۔ اس سوانح تک پہنچتے پہنچتے ان کا فن پختہ ہو چکا تھا اب وہ ایک بہترین سوانح نگار کے طور ہر سامنے آئے۔ انہوں نے واقعات کا انتخاب بڑے سلیقے سے کیا۔

واقعات کی کڑیاں آپس میں مربوط ہیں۔ جزئیات نگاری کے جو عمدہ نمونے پیش کیے گئے وہ ہیرو کی شخصیت کی تکمیل میں مدد دیتے ہیں بڑی عمدہ دلکش جزئیات نگاری کی جو ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ اس تصنیف میں انہوں نے اپنے فرائض کو بطور سوانح نگار بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا۔

ڈاکٹر ممتاز فاخرہ کے بقول:

> ''شبلی کا اسلوب بیان سوانح نگاری کے عین مناسب ہے ان کا مزاج فطری طور پر محققانہ اور مورخانہ تھا لیکن موضوع سے متعلق واقعات کی تحقیق و تنقید میں دیانت داری کا ثبوت دیتے ہوئے اسلوب کی دلکشی کے سہارے دلچسپ موقع پیش کرتے ہیں یہی وہ اسباب تھے جنکی بنا پر وہ اردو کے صف اول کے سوانح نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔''(۳۰)

"الغزالی" پہلے والی سوانح عمریوں کی طرح سوانح نگار نے اس سوانح عمری کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا۔ اس سوانح عمری میں بھی سوانح نگار کو مواد کی کمی کا سامنا کرنا پڑا۔ حالات زندگی کے حوالے سے مواد کافی کم تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ امام غزالی پر پہلے کوئی مستقل کتاب موجود ہی نہ تھی جس سے سوانح نگار استفادہ کرتا۔ ان سوانحی کتب کے علاوہ بھی شبلی نعمانی نے چند چھوٹی سوانح تحریر کیں جو مختصر ہونے کے باوجود تحقیقی نقطہ نظر سے کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ جیسے "حیات خسرو"، "سوانح عمری فردوسی"، " سعدی شیرازی" ، "سوانح مولانا روم" وغیرہ تحریر کی گئیں شبلی نعمانی کا شاہکار ان کی آخری سوانح عمری "سیرت النبیؐ" ہے۔ اس کی دو جلدیں شبلی نعمانی اپنی زندگی میں تحریر کر سکے باقی جلدیں ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے مکمل کیں۔ یہ سوانح تمام جدید اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے تحریر کرنے کی کوشش کی گئی اس سوانح میں حضورؐ سے متعلقہ معلومات حالات زندگی اور عادات و اطوار سے متعلق تمام تفصیلات کو بڑے مفصل انداز میں پیش کیا گیا۔

اس عہد میں لکھی ہوئی تمام سوانح تقریباً ایک ہی رنگ لئے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں زیادہ تر اصلاحی اور قومی جذبے کو فروغ دینے کے لیے بزرگوں نامور شخصیات اور مذہبی ہیروز کی سوانح تحریر کی گئی حالی اور شبلی کے بعد کئی چھوٹی بڑی سوانح عمریاں لکھی گئی جیسے اس عہد کے چند اہم سوانح نگار مندرجہ ذیل ہیں۔

مرزا حیات، عبدالرزاق کانپوری، ذکاءاللہ، مولوی سراج الدین احمد، حافظ عبدالرحمان، عبدالحلیم شرر، سید افتخار بگرامی اور محمد سلیمان منصور پوری کے نام سوانح نگاری میں بہت اہم ہیں۔ اس عہد میں لکھی جانے والی چند سوانح عمریوں کے نام یہ ہیں۔ "سیرت محمدیہ"، نور جہاں بیگم"، " زینب النسا بیگم"، "فردوس"، "مرزا صاحب کی حیات طیبہ"، "ارسطو"، "حیات النذیر"، "وقار حیات"، " حیات دبیر"، "سیرت سید احمد شہد"، "حیات اجمل"، "آثار جمال الدین افغانی"۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے بقول:

''اس زمانے کے بعض سوانح نگاروں نے سر سید حالی اور شبلی کی کاوش و کاہش اور کان کنی کی روایت سے فائدہ اٹھایا جس کے نتیجے میں متعدد اچھی سوانح عمریاں وجود میں آئیں۔''(۳۱)

حالی شبلی اور ان کے معاصرین کی سوانحی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ ان کی سوانح اردو ادب کاایک گراں قدر سرمایہ ہیں۔اردو سوانح نگاری کے آغاز میں یہ سوانح کافی اہمیت رکھتی ہیں۔اس عہد میں لکھی جانے والی سوانح عمریوں پر شبلی اور حالی کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان کے زیر اثر لکھی گئیں۔ ادب زندگی کی تصویر پیش کرتا ہے اس لیے اس کو زندگی کا آئینہ کہا جاتا ہے اسی طرح سوانح عمریاں بھی تہذیب و تمدن رجحانات اور تحریکات کی آئینہ دار تصور کی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں لکھی جانے والی سوانح عمریوں میں بر صغیر کی تحریکات سیاسی و سماجی حالات کے اثرات واضح دیکھے جاسکتے ہیں۔ ۱۹۱۴ء کے بعد سے لکھنے والوں مغربی سوانح نگاری سے کافی متاثر نظر آتے ہیں انہوں نے مغربی سوانح نگاری سے اثرات قبول کرتے ہوئے ان اصولوں سے استفادہ کیا۔ ان سوانح نگاروں نے مغربی سوانحی اصولوں کو برتنے اور اپنانے کی بھرپور تگ دو کی۔

اس عہد کے سوانح نگاروں نے اپنے ہیرو کی محض مداح سرائی نہیں کی بلکہ وہ اس کے کردار اور شخصیت کی خصوصیات کو پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کارناموں کی تفصیل بیان کرنا پسند نہیں کرتے بلکہ شخصیت کی تصویر کشی کرنا چاہتے ہیں "شبلی" اور "حالی" نے جس صنف کی بنیاد رکھی اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے اور آگے بڑھانے میں "سید سلیمان ندوی"، "اکرام اللہ ندوی" اور "حبیب الرحمن خان شیر وانی" سب سے آگے تھے۔ اس عہد میں سیاسی بیداری اور آزادی کی تحریک چلی اسی وجہ سے کئی سیاسی رہنماؤں کی سوانح وجود میں آئیں۔ جیسے سر سید محسن الملک، وقارالملک، مولانا محمد علی گاندھی جی، حکیم اجمل خاں کی سوانح عمریاں منظر عام پر آئیں۔ اس کے

علاوہ اس عہد میں مختلف نامور ادیبوں اور شاعروں کی سوانح بھی تحریر ہوئیں جیسے شبلی حالی اقبال کی سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ اس عہد میں سوانح عمریوں میں تذکرے اور مدح سرائی کی بجائے تحقیق و تنقید کا پہلو زیادہ واضح نظر آنے لگا۔ اس عہد کے سب سے اہم سوانح نگار سید سلیمان ندوی ہیں سید سلیمان ندوی شبلی کے شاگرد تھے۔ انہوں نے موضوع فن اور اسلوب تینوں مراحل سے گزرنے اور ان تینوں تقاضوں کو نبھانے کی پوری کوشش کی۔ ان کے اسلوب پر شبلی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے وہی انداز اپنایا جو شبلی کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے بقول:

> ”دارالمصنفین کے متعدد سوانح نگاروں نے اس روایت کی آبیاری میں ایک علمی ولولے کے ساتھ حصہ لیا مگر واقعہ یہ ہے اس باب میں سید سلیمان ندوی دارالمصنفین کے جملہ سوانح نگاروں میں سرکشیدہ نظر آتے ہیں۔“[۳۲]

دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ادیبوں نے سوانحی روایت کو آگے بڑھانے میں بہت ناقابل فراموش خدمات پیش کیں۔ اس ادارے کے ادیبوں نے سوانح نگاری کے فن کو ترقی دی اور آگے بڑھایا۔ سید سلیمان ندوی کی پہلی سوانح ”سیرۃ عائشہ“ ہے یہ سوانح اصلاحی نوعیت کی حامل ہے اس کا مقصد خواتین کی اصلاح کرنا تھا کہ کس طرح وہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں اس مکمل نمونے سے استفادہ کر سکتی ہیں۔

یہ سوانح اس لحاظ سے بھی بہت اہمیت کی حامل ہے کیونکہ کسی بھی خاتون کی یہ پہلی سوانح ہے۔ اس سوانح میں بیشتر وہی واقعات بیان کیے گئے جو سیرت رسولؐ میں بیان ہوئے ہیں۔ سوانح نگار نے زبان زد عام واقعات کو بڑی فنی مہارت اور سلیقے سے پیش کیا۔ ” سید سلیمان ندوی“ فن سوانح سے پوری طرح آگاہ اور اسے برتنے کا سلیقہ بھی خوب جانتے تھے۔ ”حیات مالک“ ان کی دوسری سوانح عمری ہے جس میں ان کا اسلوب سیدھا سادا اور دلکش ہے۔

امام صاحب کی شخصیت کی تصویر کشی کی گئی۔ ''حیات مالک'' امام مالک کی پہلی مستند سوانح عمری تصور کی جاتی ہے۔ سوانح نگار نے امام کی ''کتاب موطا'' کی تشریح بڑے مفصل انداز سے کی۔

رحمت عالم حضرت محمدؐ کی سوانح عمری ہے اس سے پہلے حضرت محمدؐ کی زندگی سے متعلق متعدد سوانح منظر عام پر آچکی تھیں مگر سید صاحب نے بڑی فنی مہارت کا ثبوت فراہم کیا۔ سید صاحب کے پاس مواد کی بھرمار تھی مگر انہوں نے چھوٹے چھوٹے اہم واقعات کا انتخاب کیا جس کو ہر خاص و عام سمجھ سکے۔ سید سلیمان ندوی کی آخری سوانح عمری ''حیات شبلی'' ہے۔ جو انہوں نے اپنے محترم استاد کے بارے میں تحریر کی۔ اس سوانح میں شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی تصویر پیش کی گئی اور ہیرو کی زندگی کے ہر پہلو کی مکمل تصویر کشی کی۔ یہ اردو ادب کی ایک مفصل سوانح ہے۔ سید سلیمان ندوی کے بعد رئیس احمد جعفری کی سوانح عمریاں بھی اردو کے سوانحی ادب کی روایت میں کافی اہم ہیں۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۷ء کی درمیانی مدت میں لکھی جانے والی سوانح عمریاں زیادہ مقصدی اور سیاسی طرز کی ہیں۔ تمام آنے والے سوانح نگاروں نے حالی اور شبلی کی پیروی کی اور ان کے وضع کردہ اصولوں کو اپناتے ہوئے سوانح تحریر کیں مغرب میں اس وقت سوانح نگاری باقاعدہ ایک صنف کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ مگر برصغیر میں اسے مستقل صنف کا درجہ نہیں مل سکا تھا۔

دور جدید میں مستند واقعات کو منظم اور مرتب شکل میں پیش کیا گیا تاکہ شخصیت کی پوری تصویر بھی پیش ہو سکے اور وہ جاذب نظر بھی ہو پہلے کی طرح محض کارناموں کی تفصیل اور معلومات ہی بیان نہ کی جائیں بلکہ سوانح کا مقصد ایک شخصیت کی مکمل تصویر پیش کرنا ہوتا ہے۔ نہ کہ اس کی زندگی کے کارناموں اور حالات و واقعات کے متعلق معلومات کا انبار لگا دینا۔ دور جدید میں غیر ضروری تفصیلات کو پیش کرنے کی بجائے شخصیت کی حقیقی تصویر کشی پر زور دیا جانے لگا۔ اس دور میں علم نفسیات اور جدید سائنس نے انسان کے ذہن پر کئی اثرات مرتب

کیے ان اثرات کے زیر اثر وہ فرد کی شخصیت اور اس کے مزاج کو سمجھنے کے قابل ہوا اس کی مثال فرحت اللہ بیگ کی ”ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی“ ، ”عصمت چغتائی“ کا ”دوزخی“ اور رشید صاحب کا ”ذاکر صاحب“ اس کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے بھی اپنے استاد کا سراپا کردار اور رہن سہن کی بڑے متاثر کن انداز میں تصویر پیش کرنے کی کوشش کی۔ فرحت اللہ بیگ نے بڑی بے تکلف اور تخلیقی زبان کا سہارا لے کر اپنے استاد کی تمام انسانی خوبیوں اور خامیوں کو بیان کر دیا۔

یہ مختصر سوانح عمری اور اردو ادب میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ”دوزخی“ میں عصمت چغتائی نے بھی اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کی سوانح تحریر کی۔ یہ سوانح بھی انتہائی مختصر ہے مگر اردو ادب میں بڑی قدر و منزلت کی حامل ہے کیونکہ اس کا مواد اور اسلوب دونوں بہت عمدہ ہیں۔ عصمت چغتائی نے اپنے بھائی کی زندگی کے تمام پہلوؤں اور تلخ حقیقتوں کی تصویر کشی دلکش اسلوب اور عمدہ زبان میں کی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے بھائی کی زندگی کے رنج والم کی تصویر بھی پیش کی۔ رشد احمد صدیقی کی سوانح ”ذاکر صاحب“ بھی ایک بہترین سوانح ہے۔ صدیقی صاحب نے ایک بہت بہترین سوانح نگار کی طرح زندگی کے واقعات کو بیان کرنے کے لیے اپنے مخصوص شگفتہ اور بے تکلف انداز بیان سے کام لیا اور شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا۔ یہ تینوں سوانح عمریاں باقاعدہ سوانح نہیں بلکہ خاکے ہیں مگر ان میں شخصیت کی تصویر کشی بڑی عمدگی سے کی گئی جس سے ایک شخصیت کی مکمل اور واضح تصویر قارئین کی آنکھوں میں گھومنے لگی ہے۔ یہ تحریر مختصر ہونے کے باوجود بہت اہم ہیں۔

اس عہد میں دو رجحان واضح نظر آئے ایک حالی اور شبلی کے پیروکار دوسری طرف جدید اصولوں کو اپنانے والے۔ جدید رجحان کے حامل سوانح نگاروں نے جدید تقاضوں کو اپناتے ہوئے ہیرو کی تحریروں خطوط روزنامچو

سے مدد لیتے ہوئے اور عزیز واقربا کی آرا کی روشنی میں شخصیت کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان جدید سوانح نگاروں نے ہیرو کی زندگی کے حالات و واقعات اور کارناموں کا جائزہ لینے کے بعد اس کی ظاہری اور باطنی کیفیات کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔

اس عہد میں کئی شاہکار سوانح عمری وجود میں آئیں جو ادبی اور فنی نقطہ نظر سے قدرو منزلت کی حامل ہیں۔ ان سوانح عمریوں کو سوانح نگاری کے جدید تقاضوں موضوع اسلوب اور تحقیق و تنقید کے عین مطابق تحریر کیا گیا۔ اس عہد کی سوانح میں مولانا عبدالسلام ندوی کی سوانح عمریاں ''سیرت عمر بن عبدالعزیز''، ''اقبال کامل''، ''امام رازی''، ''مولانا حیدر حسن خاں'' بہت مشہور ہیں۔ جیسے کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اس عہد میں دو ر رجحان غالب تھے ایک قدما کی پیروکار اور دوسرا جدید اسلوب کے حامل سوانح نگار مولانا عبدالسلام ندوی کی سوانح عمریاں پہلے رجحان کی حامل ہیں۔ جدید اسلوب کی حامل سوانح عمریوں میں قاضی عبدالغفار کی سوانح عمریاں شامل ہیں جیسے ''آثار ابوالکلام آزاد'' اور ''حیات اجمل'' ہیں جو نئے اور جدید اصولوں کو مد نظر رکھ کر تحریر کی گئیں۔

اردو کے سوانحی ادب کی روایت میں آگے بڑھتے ہیں تو صالحہ عابد حسین کی سوانح بہت اہم ہیں جو اس نے اپنے نانا حالی کی سوانح تحریر کی ''یاد گار حالی'' یہ حالی کی حیات کے حوالے سے پہلی باضابطہ سوانح ہے اس سے پہلے حالی کے حالات زندگی مختلف تذکروں اور مضامین میں بکھرے ہوئے ملتے تھے۔ صالحہ عابد حسین نے اس بکھرے مواد کو اکٹھا کر کے یک جان کر دیا۔ مصنفہ نے اپنے ہیرو کی شخصیت کی تشکیل ایک بہترین سوانح نگار کی طرح کی۔ مصنفہ نے ہیرو کی شخصیت ہم آہنگ اسلوب بیان اور طرزِ تحریر کا انتخاب کیا ہے۔

ڈاکٹر ممتاز فاخرہ کے بقول:

> ''سوانح نگاری میں اسلوب کو خاص اہمیت حاصل ہے شگفتگی اور شادابی کے ساتھ علمی معیار بھی پیش نظر ہونا چاہیے حالی کی شخصیت کی عکاسی میں مصنفہ کے اسلوب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔حالی کی سیرت کی مطابقت سے اسلوب بھی سادہ متوازن سنجیدہ و شگفتہ ہے''۔(۳۳)

اردو ادب کے سوانحی سرمایے میں آگے بڑھیں تو عبدالماجد دریا آبادی کی تحریر کردہ سوانح عمریاں بہت اہم ہیں۔ انہوں نے مغربی اور مشرقی دونوں روایتوں سے اثر قبول کیا اور اپنے لیے نئی راہیں تراشیں۔ وہ خطوط اور ذاتی تاثرات کی مدد سے ہیرو کی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ انہوں نے واقعات کے انتخاب میں کافی سلیقے کا ثبوت دیا۔ ان کی سوانح عمریاں ''حکیم الامت'' نقوش تاثرات۔''محمد علی ذاتی ڈاکری کے چند ورق'' ہیں۔اردو سوانح نگاری کی روایت اسی طرح رفتہ رفتہ آگے بڑھ گئی اور کئی ارتقائی اور تدریجی مراحل سے گزرتی ہو گی۔ طوالت سے بچنے کی خاطر ان سوانح عمریوں کے صرف نام درج کیے جاتے ہیں۔

''ذکر اقبال''، ''منٹو''، ''سوانح عمری خواجہ حسن نظامی''، ''تذکرہ جگر''، ''حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی''، ''سوانح عمری حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری''، ''حیات عبدالحیٔ''، ''حیات ذاکر حسین''، ''حیات سلیمان''، ''گاندھی جی''، ''نظامی بد ایوانی''، ''حیات شیخ الاسلام''، ''حیات رضا''، ''خواجہ دستگیر''، ''پریم چند''، ''حیات اکبر''، ''خاتم الانبیاء''، ''الزبیری''، ''سیرت قر آئینہ رسول عربی''، ''صدیق اکبر''، ''ظفر علی خاں''، ''مجید لاہوری''، ''حیات قائد اعظم''، مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے''، ''حیات مراتب''، ''محسن

انسانیت" اور اس طرح کی کئی سوانح عمریاں تحریر کیں اور سوانح کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اس عہد میں مذہبی رہنماؤں کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی سیاسی و سماجی شخصیات کی سوانح عمریاں بھی تحریر کی گئیں۔

دورِ جدید میں سوانح کے فن میں کئی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ تقسیم ملک اور فسادات ٹیکنالوجی کی ترقی نے انسان کے ذہن میں انقلاب پیدا کر دیا اس کے ساتھ وہ مغربی علوم سے کافی اثرات قبول کرنے لگے۔ ان اثرات کی وجہ سے اس عہد میں سماجی علمی و ادبی شخصیات پر زیادہ تعداد میں سوانح لکھی جانے لگی۔ ان سوانح نگاروں نے سوانح نگاری کے فن میں کئی تبدیلیاں کی اور اس فن کو کئی نئی جہتوں سے روشناس کروایا۔ جدید سوانح نگاروں کی کوششیں قابل ستائش ہیں۔ انہوں نے اس فن کو بلندی تک پہنچا دیا اور کئی نئے تقاضوں کو سوانح نگاری کا حصہ بنایا۔ ان سوانح نگاروں نے محض ہیرو کے کارنامے ہی نہیں گنوائے بلکہ اس کی شخصیت کی صحیح تصویر کشی کی۔

پاکستان کے قومی و ملی رہنماؤں اور ہیروز پر متعدد سوانح عمریاں تحریر کی گئیں جن سب کا تذکرہ تفصیل سے کرنا مشکل ہے۔ یہ سوانح عمریاں کافی دلچسپ اور مستند تصور کی جاتی ہیں کیونکہ ان سوانح عمریوں کو تحریر کرتے وقت تحقیق و تفتیش سے کام لیا گیا اور قابل رشک شخصیات کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو جزئیات سے بیاں کیا گیا۔

تصاویر اور دستاویزات کی شمولیت نے ان کو مستند اور دلچسپ بنا دیا۔ جیسے عزیز بھٹی شہید کی سوانح اصغر علی گھرال نے لکھی اور "فاتح" ہارون الرشید نے بڑے غیر روایتی انداز میں تحریر کی۔ ہمارے قومی ہیرو اور مفکر پاکستان علامہ اقبال کی زندگی پر بھی لا محدود سوانح تحریر کی گئیں جن کے صرف نام درج کیے جاتے ہیں۔ "سر گزشت اقبال"، "دانائے راز"، "حیات اقبال" اور "مفکر پاکستان" چند اہم سوانح عمریاں ہیں۔ اس کے بعد اقبال کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی اپنے والد کی سوانح لکھی جیسے اقبال کی سب سے تفصیلی جامع اور ضخیم سوانح عمری تصور کیا جاتا ہے۔ "زندہ رود" اقبال کی بہت اہم سوانح ہے۔ اردو ادب میں جتنی سوانح عمریاں محسن انسانیت

اور ہمارے پیارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ پر لکھی گئیں کسی اور شخصیت پر نہ لکھی گئی اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ سیرت النبی اردو سوانح نگاری میں سب سے اہم بڑا موضوع تھا۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے بقول:

> ''اردو میں سوانح عمری کی عمر کچھ بہت زیادہ نہیں ہے مگر اس مختصر مدت میں بھی وہ ایک لمبی مسافت کی دھوپ چھاؤں سے گزری ہے چنانچہ اردو کے نثری ادب میں سوانح کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ملتا ہے جس میں ہر نوع کم و کیف اور عیار و اعتبار کی سوانح ملتی ہیں۔''(۴۴)

سوانحی ادب نے وقتاً فوقتاً کافی ترقی کی۔ انداز بیاں اور پیش کش میں کئی نئے تجربات پیش ہوئے۔ جیسے جیسے اس صنف نے ترقی کی اور کئی ارتقائی مراحل سے گزری تو اس میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ اس صنف کا آغاز تو کافی تشفی بخش رہا مگر آپ بیتی کے مقابلے میں اس صنف کی ترقی کی رفتار کافی سست ہو گئی حالانکہ اس صنف کا آغاز پہلے ہوا تھا۔ سوانحی فن کو جتنی ترقی مغربی زبانوں میں ملی شاید اتنی اس کو اردو میں نہیں مل سکی مگر چند عمدہ نمونے اردو زبان میں بھی ملتے ہیں جو نا قابل فراموش ہیں۔ اردو ادیبوں فارسی تذکروں اور دکنی عہد کی اردو مثنویوں میں اس صنف کے واضح آثار ملتے ہیں۔ انیسویں صدی کے نصف آخر کو سوانح نگاری کا سنہرا دور تصور کیا جاتا ہے۔ حالی شبلی اور ان کے معاصرین اس عہد کے اہم اور قابل قدر سوانح نگار ہیں۔ سوانحی روایت کا جائزہ لینے کے بعد اب سوانح نگاری کے فن کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

۳۔ اردو میں سوانح نگاری کا فن:۔

اردو میں سوانح کا ذخیرہ کافی وسیع ہے۔ ایسی قوم جس کا ماضی پر شکوہ روشن اور عظیم ہو اس میں سوانح نگاری کا مواد وافر مقدار میں موجود نہ ہو ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ عربی اور فارسی کی طرح اردو میں بھی لاتعداد سرمایہ موجود

ہے۔ کسی شخص کے حالات زندگی اور واقعات زندگی کی تصویر کشی کرنا سوانح نگاری ہے۔ یہ ایک مشکل فن ہے۔ سوانح عمری سوانح نگار کی فنی اور تخلیقی تمام صلاحیتوں کو استعمال میں لاتے ہوئے اس صنف ادب کو تحریر کرتا ہے۔ یہ اس کی تخلیقی کاوشوں کا ثبوت ہے۔ سوانح نگار کئی آزمائشوں اور مشکل مراحل سے گزرتے ہوئے یہ دشوار گزار کام سرانجام دیتا ہے۔ سوانح نگار اپنے ہیرو کی صحیح تصویر کشی کے لیے بطور محقق مورخ مبصر ماہر نفسیات اور ادیب کے اپنے فرائض سر انجام دیتا ہے۔ وہی سوانح عمری فنی اعتبار سے بلند پایہ ہو گئی جس میں سوانح نگار تمام مروجہ اصولوں کو اپناتا ہے۔ جو سوانح نگار اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے سوانح تحریر کرے وہی سوانح فنی اور تخلیقی اعتبار سے اہم خصوصیات کی حامل ہو گی۔ یہاں چند خصوصیات کا تذکرہ کیا جائے جو اس سوانح عمری میں ہونے چاہئیں یا ایک سوانح نگار میں جن اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے۔

ا۔ موضوع کا انتخاب / شخصیت سے واقفیت / شخصیت کی عکاسی:۔

کوئی بھی سوانح لکھنے سے پہلے سب سے پہلا کام موضوع کا انتخاب ہوتا ہے کہ کس موضوع کا انتخاب کیا جائے اور اسے کس انداز میں بیان کیا جائے۔ اس لیے سوانح میں بنیادی اہمیت موضوع کا حاصل ہے۔ سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ موضوع کا انتخاب عقل مندی دیانت داری اور غیر جانب داری سے کرے اسے صرف اس شخصیت کا انتخاب کرنا چاہیے جیسے وہ پوری طرح جانتا ہو۔ موضوع کا انتخاب کرتے ہوئے دقت اس وقت پیش آتی ہے جب شخصیت کے نظریات و تصورات اور مصنف کے نظریات میں مطابقت نہ ہو تو نظریات کے ٹکراؤ کی وجہ سے تحریر میں کئی خامیاں در آسکتی ہیں لہٰذا نظریات میں مطابقت ہونا ضروری ہے تاکہ بعد میں مسائل پیدا نہ ہوں اور کہیں ہیرو کی شخصیت کی تصویر مسخ نہ ہو جائے جیسے اگر مصنف کو شاعری سے دلچسپی نہ ہو تو وہ کیسے ایک شاعر کے کلام کو سمجھ سکے گا یا اس پر اپنی رائے کا اظہار کر سکے گا۔ ایسے موضوعات کا انتخاب کرنا چاہیے جن پر مصنف پوری

غیر جانب داری کے ساتھ لکھ سکے۔ سوانح نگار کو موضوع سے دلچسپی اور ہمدردی ہونا لازمی امر ہے۔ سوانح نگار کو ایسے موضوع کا انتخاب کرنا چاہیے جس کے بارے میں اس کو مواد دستیاب ہو سکے اور وہی موضوع اپنائے جس کے مواد تک رسائی ممکن ہو۔

سوانح نگار کے لیے اپنے ہیرو کی شخصیت سے آگاہی اور شناسی ہونا ضروری ہے۔ اگر سوانح نگار کو اپنے ہیرو کی شخصیت سے واقفیت نہ ہو اور اگر وہ اسے ذاتی طور پر جانتا نہ ہو تو وہ کیسے اس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکے گا ہیرو کی ذات میں دلچسپی لیے بغیر حالات وواقعات کا بیان ممکن نہیں۔

اسی طرح اگر سوانح نگار کی ہیرو سے کوئی جذباتی وابستگی نہ ہو تو وہ ایک معیاری اور بلند پایہ سوانح عمری تحریر کرنے میں ناکام ہو جائے گا۔ سوانح نگار کو بے تکلف انداز بیان اپناتے ہوئے شخصیت کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے کی سعی کرنی چاہیے۔

الطاف فاطمہ کے بقول:

> ”سوانح نگاری کسی فرد واحد کی شخصیت کو منظر عام پر اس طرح لانے کا نام ہے کہ اس کی فطرت اور سیرت کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ رہے اس میں لکھنے والا اپنے ذاتی جذبات کو شامل کرنے کا مجاز نہیں ہے۔“[۳۵]

تمام مواد کو اپنے مخصوص انداز میں تحریر کرتے ہوئے مصنف کو ہیرو کی زندگی کے تمام پہلوؤں اور تلخ حقیقتوں اور رہن سہن سے قاری کو واقف کروانا چاہیے۔ سوانح نگار کو ہیرو کے عہد کی معاشرت کی جھلکیاں بھی پیش کرنی چاہیے تاکہ ہیرو کی شخصیت اور رہن سہن سے قاری واقف ہو سکے اور ہیرو کی شخصیت کو جان سکے۔ ہیرو کی

شخصیت کی سچی تصویر کشی مصنف کا کام ہے۔ مصنف کو شخصیت کی زندگی سے متعلق زیادہ سے زیادہ تفصیلات بیان کرنی چاہیے:

ڈاکٹر گیان چند کے بقول:

"اس میں کسی شخص کے حالات زندگی اور شخصیت کے بارے میں لکھا جاتا ہے یہ ایک مختصر مضمون بھی ہو سکتا ہے پوری کتاب بھی پہلے اسے سیرت کہا جاتا تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں شخصیت کا بیان اہم ہوتا تھا۔"(۳۶)

سوانح نگاری کا سب سے اہم پہلو اس فرد کی شخصیت کی تصویر کشی ہوتا ہے جس کی سوانح لکھی جا رہی ہے۔ سوانح نگار کو ہیرو کی کمزوریوں اچھائیوں ظاہری حالات و واقعات باطنی کیفیات رجحانات پسند ناپسند غرض زندگی کے ہر پہلو کو اس طرح احاطہ تحریر میں لانا چاہیے کہ اس کی شخصیت کی واضح تصویر قارئین کے نگاہ میں گھومنے لگے۔ ایسی شخصیت کا انتخاب کرنا چاہیے جس کے بارے میں واقع ہی لوگ کچھ جاننے کے خواہش مند ہوں جو غیر معمولی شخصیت ہو۔ لوگ جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ وہ بڑا آدمی یا ہیرو ہے تو کیسے بڑا آدمی بنا کون سے حالات وواقعات نے اسے ہیرو بنا دیا۔ چاہے وہ کسی بھی میدان کا ہیرو ہو سیاسی سماجی ادبی یا روحانی۔

اس صنف ادب میں مصنف کسی اہم شخصیت کی تصویر کشی کرتا ہے یا اس کا ماڈل بنا کر پیش کرتا ہے۔ مصنف کو اپنے ہیرو کی شخصیت کے بارے میں لکھی جانے والی تمام تحریروں کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ اس کے بارے میں رائے قائم کرنے میں آسانی رہے۔

ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہین کے بقول:

”حیات نگار کی بالغ نظری معمولی معمولی واقعات سے بھی مفید مطلب باتوں کو چھانٹ کر شخصیت کو ایسا وجود دیگی کہ شخصیت اپنی پوری خصوصیات اور پیچیدگیوں کے ساتھ اجاگر ہو جائے۔“(۳۷)

کسی شخصیت کا انتخاب کرنا ایک مشکل امر ہے۔ سوانح عمری لکھنا ایک دشوار گزار کام ہے کیونکہ اس میں نہ صرف حقائق کا بیان ہوتا ہے بلکہ سوانح نگار کو قارئین کی دلچسپی کا سامان بھی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ جس عہد کی شخصیت کی سوانح لکھی جارہی ہے اس کے عہد کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے زمانے شخصیت پر کوئی نہ کوئی اثرات مرتب کرتا ہے۔ زمانہ ہیرو کے ذہنی ارتقا میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ہیرو کے عہد کا جائزہ لینا بھی سوانح نگار کا کام ہے۔ سوانح نگار ہیرو کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا جائزہ تحقیقی و تنقیدی نظر سے لے کر قارئین کے سامنے جوں کا توں بیان کرے بغیر کوئی خیانت کیے اور بغیر کسی رعایت کے لیے اس کا بطور سوانح نگار اہم فرض ہے۔

سوانح نگار کو جذبات کی رو میں بہنا نہیں چاہیے اور نہ ہی جذبات کو خود پر حاوی کرنا چاہیے۔ ہیرو کے محاسن کے ساتھ ساتھ مصائب کا بیان بھی کرنا چاہیے ہیرو کی کمزوروں کی پردہ پوشی نہیں کرنی چاہیے۔ اس طرح شخصیت کی سچی عکاسی ممکن نہیں ہو سکے گی۔

۲۔ مواد کی اہمیت / فراہمی مواد:۔

شخصیت یا موضوع کے انتخاب کے بعد سب سے اہم چیز سوانح عمری میں مواد کی فراہمی ہوتی ہے۔ جس شخصیت پر قلم اُٹھایا گیا ہو اس کے بارے میں مکمل معلومات ذاتی روابط اور مواد بہت اہم ہے۔ اس میں بعض اوقات

حیات نگار کے پاس موجود مواد ہی اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کو استعمال میں لاتے ہوئے شخصیت پر کام کر سکتا ہے۔ حیات نگار کے ذہن میں حالات وواقعات کا انبار اس کو سوانح لکھنے پر مجبور کرتا ہے۔

ہیرو کی شخصیت سے جڑی دلآویز باتیں حیات نگار کو لکھنے کی طرف مائل یا آمادہ کرتی ہیں۔ وہ شخصیت سے وابستہ اپنے خیالات کو تحریر کرنا چاہتا۔ وہ سب سے پہلے اپنے تمام ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے مواد کو اکٹھا کرتا ہے۔ اگر سوانح نگار ذاتی طور پر ہیرو سے آشنائی رکھتا ہے اور اس کے اطوار وخصائل سے بھی واقفیت رکھتا ہے تو وہ اپنے ذاتی مشاہدات تجربات اور معلومات سے کام لیتے ہوئے اپنی معلومات کو تحریر کرے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے تحریری مواد کی ضرورت بھی ہوگی صرف اپنی ذاتی معلومات پر اعتماد نہیں کر سکتا کیونکہ شخصیت کی زندگی کے کئی گوشے اس کی نظر سے اوجھل بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ دوسرے لوگوں کی رائے بھی طلب کرے گا اور ہیرو کے بارے میں معلومات اکٹھی کرے گا۔ معلومات اکٹھی کرنے کا ایک اور موثر ذریعہ عزیز واقربا قریبی ساتھی دوست رشتے دار خاندان اور اولاد بھی ہیں وہ ان سب سے مواد کے سلسلے میں ضرور رجوع یا رابطہ کرے گا۔ پھر اس کے بعد سوانح نگار کا فرض ہے کہ ان سے اکٹھی کی گئی معلومات کا تجزیہ کرے صحیح نتائج اخذ کرنے کی سعی کرے۔ ان ذرائع سے حاصل ہونے والی مفید معلومات کا تجزیہ مصنف کو اپنی رائے بنانے میں بھی مدد دے گا۔

ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہین کے بقول:

> ”حیات نگار کے لیے لازم ہے کہ وہ اہل خانہ کے ذریعے دی ہوئی معلومات پر بلا چون وچرا ایمان نہ لے آئے بلکہ ان کا واقعات کی مختلف کڑیوں سے مقابلہ اور موازنہ کرے مختلف کڑیاں حیات نگار کے دائرے کو یقیناً وسیع کریں گی۔“(۳۸)

اس کے علاوہ معلومات اور مواد حاصل کرنے کا سب سے موثر ذریعہ وہ تحریریں ہیں جو ہیرو کے بارے میں لکھی گئی ہیں یا جو اس کی طبع زاد ہیں۔ ان سب تحریروں سے رجوع کرنا بھی بہت اہم ہے۔ سوانح کے سلسلے میں خود نوشت تحریر میں بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ مگر انھیں تنقید کی کسوٹی سے گزارنا پڑتا ہے تاکہ حقیقت تک رسائی حاصل ہو سکے۔ خود نوشت تحریروں میں سے بہت سی مفید معلومات دستیاب ہو سکتی ہیں۔

تحریری مواد جو ہیرو کے متعلق حاصل کیا جاتا ہے اس میں خطوط بھی شامل ہیں جو ہیرو نے وقتاً فوقتاً اپنے دوستوں عزیزوں اور اہل خانہ کو لکھے ہوتے ہیں۔ خطوط میں ہیرو اپنی ذہنی و قلبی کیفیات کا اظہار کرتا ہے اور اس پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے۔ خطوط سوانحی مواد میں بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ خطوط میں جس بے تکلفی سے جذبات و احساسات کا اظہار کیا جاتا ہے ایسا اور کہیں ملنا مشکل ہے کیونکہ خطوط میں وہ باتیں بھی لکھی جاتی ہیں جو آمنے سامنے بیٹھ کر لکھنے میں خاصی مشکل ہوتی ہیں۔ خطوط میں با آسانی اظہار ممکن ہے۔ خطوط میں بڑے سلیقے سے اپنا مدعا بیان کیا جا سکتا ہے۔ خطوط مغرب اور مشرق دونوں میں یکساں مقبولیت اور قدر و منزلت کے حامل ہیں۔ اس میں معلومات کا لامحدود ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ سوانح نگار ہیرو کے عہد تہذیبی و ثقافتی سماجی و سیاسی حالات اور شخصیت کو سمجھنے میں خطوط بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ خود نوشت کی طرح خطوط کو بھی تحقیقی اور تنقیدی نگاہ سے گزرنا چاہیے اور سوانح نگار کو بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

خطوط کے بعد مواد میں سب سے اہم چیز ہیرو کی ڈائری اور روزنامچے ہیں ان میں معلومات کا بے انتہا ذخیرہ موجود ہو گا اس سے ملنے والا مواد سوانح عمری کے لیے کار آمد ثابت ہو سکے گا کیونکہ اگر وہ ڈائری روزانہ کی بنیاد پر لکھی گئی ہے تو پھر کئی رومرہ کے اہم واقعات اور نکات اس میں تحریر ہوں گے جو حیات نگار کے لیے کافی اہمیت کے حامل ہوں گے۔ ان معلومات سے حیات نگار پر واضح ہو جائے گا کہ روزمرہ واقعات اور حالات نے اس کے ہیرو

پر کیا اثرات مرتب کیے اور اس کے ذہن و فکر میں کیا تبدیلیاں رونماں ہوئیں اس سے بھی آگاہی ہو جائے گی۔ حیات نگار کے لیے کافی آسانی پیدا ہو جائے گی۔ روز ناموں اور یا دداشتوں سے مدد لے کر ہی شخصیت کی تعمیر و تشکیل ممکن ہوتی ہے کیونکہ ان میں ہیرو اپنے خیالات اور کردار کا اظہار کھل کر کرتا ہے۔ واقعات کی ترتیب میں بھی روزنامچے اور ڈائری بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ مشرقی ممالک میں روزنامچے اور یادداشتیں لکھنے کا رواج خاصہ کم ہے اس لیے ان سے متعلق مواد کم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہین کے بقول:

> ”چائے کے ہوٹلوں پبلک مقامات عوامی جلسہ گاہیں شاعر کا کلام بیاضیں اور ادیب کے یادداشتی نوٹ بھی فراہمی مواد کا بہترین ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ قہوہ خانے کی آزاد خیال آرائی بھی حیات نگار کو ایسی پتے کی باتیں فراہم کر سکتی ہے جس تک کسی دوسرے ذریعے سے رسائی ممکن نہیں ہوئی۔“(۳۹)

مرنے کے بعد کئی معروف شخصیات کے بارے میں رسالے کے خاص نمبر شائع کرتے ہیں۔ اخباروں میں کالم لکھے جاتے ہیں مضامین شائع ہوتے ہیں وہ بھی سوانح نگار کے لیے مفید معلومات ہیں۔ بعض اوقات مواد کی فراوانی بھی حیات نگار کے لیے مشکل کھڑی کر دیتی ہے کیونکہ اگر مواد کی فراوانی ہو تو پھر حیات نگار کا کام خاصا مشکل ہو جاتا ہے اسے اپنے مطالعے کے زور اور چھان بین سے کام لینا ہو گا۔ اسے محنت اور تحقیق سے کام لینا ہو گا اور سارے مواد کا مطالعہ کر کے شخصیت کے خدوخال واضح کرنے والے واقعات اور پہلوؤں کا انتخاب کرنا ہو گا یہ ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اور حیات نگار سے ذہنی مشقت کا تقاضہ کرتا ہے۔ مواد کی چھانٹ کا کام خاصہ محنت طلب ہے فراہمی مواد کے لیے سوانح نگار کو بڑی محنت اور کاوشیں کرنی پڑتی ہیں۔

۳۔ واقعات کا بیان:۔

سوانح نگار کو واقعات کے بیان میں چھان بین سے کام لینا چاہیے وہی واقعات بیان کرے جو حقیقت پر مبنی اور سچے ہوں۔ واقعات کو منطقی ترتیب سے تحریر کرنا سوانح نگار کا کام ہے۔ صرف انہی واقعات کا انتخاب کرنا چاہیے جن کا تعلق براہ راست ہیرو کی زندگی سے ہو۔ غیر ضروری واقعات سے تحریر کو بے جا طویل کرنا مناسب فعل نہیں اس طرح تحریر میں چاشنی پیدا نہ ہو سکے گی۔ حیات نگار کو بڑے سلیقے سے واقعات کا انتخاب کر کے انھیں ترتیب دینا چاہیے۔ اسی مواد کی روشنی میں جو اسے فراہم ہے حیات نگار کو تصنیف و تالیف کے تمام اصولوں کو اپناتے ہوئے سوانح عمری تحریر کرنی چاہیے تاکہ اس کی تحریر بلند پایہ اور معیاری ہو۔

رفیع الدین ہاشمی کے بقول:

"بیان واقعات میں علمی اور سائنٹفک انداز ضروری ہے۔"(۴۰)

سوانح نگار شخصیت سے جڑے بعض تاریخی واقعات کا تذکرہ بھی کرتا ہے ان میں توازن اور تناسب ہونا چاہیے غیر ضروری واقعات کے انتخاب سے گریز کرنی چاہیے۔ سچے اور حقیقی واقعات کا بیان سوانح عمری کو معیاری بنائے گا۔ بناوٹ اور مبالغہ آرائی سے پرہیز کرنا مناسب عمل ہے۔ بے سروپا باتوں کا تذکرہ سوانح کو سطحی کر دے گا۔

ڈاکٹر عبد القیوم کے بقول:

"ہیرو جس ماحول میں پرورش پاتا ہے اس کے اثرات اس کی زندگی پر حاوی ہوتے ہیں اس لیے کسی فرد کی سیرت اور ذہنی ارتقا کے بغیر اس دور کی تمدنی زندگی کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ یہاں بھی وہی باتیں بیان کرنی چاہئیں جو ہیرو کی زندگی سے براہ راست تعلق رکھتی ہوں۔"(۴۱)

سوانح نگار کو واقعات کی صحت کا بھی مکمل خیال رکھنا چاہیے تا کہ ہیرو کی واضح تصویر سامنے لائی جاسکے۔ واقعات کا دلچسپ بیان سوانح میں دلچسپی پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ سوانح میں واقعات کو بیان کر دینے سے سروکار نہیں ہوتا بلکہ معیاری سوانح میں واقعات کا بیان نہایت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ واقعات کی کڑیاں آپس میں مربوط ہونا ضروری ہے۔ ورنہ تحریر بے ربطگی کا شکار ہو جائے گی۔

ہیرو کی زندگی کا ہر واقعہ اہم نہیں ہوتا تمام واقعات کو بیان کرنا بھی مناسب نہیں کیونکہ تحریر طوالت کا شکار ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے چند اہم واقعات کا انتخاب کر کے ان کو سلیقے سے ترتیب دینا حیات نگار کا کام ہے۔ سوانح نگار کو ہر معمولی اور غیر معمولی بات کا علم ہونا چاہیے۔ تب سے وہ سلیقے سے تمام معلومات اور واقعات کو بیان کر سکے گا۔ واقعات کے انتخاب میں حیات نگار کو کافی محتاط رہنا پڑا ہے۔ وہ ان تمام واقعات کو نظر انداز کرے جن کا تعلق براہ راست ہیرو کے کردار اور حالات پر پڑا ہو۔ یہ حیات نگار کا کام ہے کہ وہ اہم اور ضروری واقعات کو منتخب کرے اور پھر اس پر منحصر ہے کہ وہ ان واقعات سے کیسے خاکہ تیار کرتا ہے۔ وانح نگار کو واقعات میں کانٹ چھانٹ اور چھان بین میں احتیاط برتنی چاہیے۔

الطاف فاطمہ کے بقول:

> ''حالات کی کاٹ چھانٹ میں بڑی احتیاط سے کام لیا جائے اور زندگی کے بعض پہلوؤں کو ہر گز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے مثلاً اس کے سراپا اور دکھاوے کی تفصیلات اس کا لب و لہجہ اس کا طرز کلام بہت ضروری چیزیں ہیں جو اس کے مزاج اور کردار پر روشنی ڈالتی ہے۔''(۴۲)

سوانح نگار کو جراتمندی کا ثبوت دیتے ہوئے ہیرو کے محاسن و مصائب کو بیان کرنے میں زرا برابر بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ ان واقعات کو بیان کرنے سے گریز کرنا مناسب ہے جیسے بیان کرنے سے ہیرو

نے منع کیا ہو۔ سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ ان کے ذاتی راز کی پردہ داری کرے جیسے اس کے محبت ناموں وغیرہ کی تشہیر کرنا مناسب فعل نہیں جو چیزیں وہ اپنی زندگی میں خود منظر عام پر لانا پسند نہیں کرتا ان کو نہ بیان کرنا اچھا عمل ہے۔ سوانح نگار کے سامنے واقعات کا انبار لگا ہوتا ہے۔ ان محل کے اعتبار سے صحیح ہوں۔ واقعات کے بیان میں تسلسل ہونا اشد ضروری ہے۔ اگر سوانح نگار ہیرو کو ذاتی طور پر جانتا ہو تو اس کے لیے واقعات اکٹھا کرنے میں آسانی ہو گی۔ کسی بھی فرد کی زندگی پر کشش واقعات سے بھری ہوئی ہے ہر واقعہ اپنے اندر کشش رکھتا ہے یہ سوانح نگار کا کام ہے کہ وہ ان میں سے کیسے واقعات کا انتخاب کرتا ہے۔ اچھا سوانح نگار ہیرو کے سفر حیات کے تمام واقعات پر سنجیدگی سے غور کرتا ہے اور ان میں سے اہم باتوں کو الگ کرتے ہوئے موضوع سے مناسبت رکھنے والے واقعات کا انتخاب کرتا ہے۔

ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہین کے بقول:

> "واقعات کا دفتر جمع کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ حیات نگار کو چاہیے کہ ان کے نفسیاتی تجزیہ بھی کرتا چلے نفسیاتی تحلیل کا یہ عمل خود حیات نگار کی صلاحیتوں نے زندگی کے تجربوں اور نیت وارادے کی کیفیتوں کا جال کھول دے گا۔"(۴۴)

جو بات شخصیت کا جزو نہیں ہوتی ان کا بیان کرنا بے معنی ہے ہیرو کی زندگی واقعات وحادثات اور مسائل سے بھری ہوئی ہے۔ ہر واقعہ اپنے اندر مخصوص کشش رکھتا ہے اس کی زندگی کے یہی واقعات آپس میں پورہ طرح ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ ان واقعات کی کڑیاں آپس میں مل کر زندگی کا ایک نقشہ ترتیب دیتی ہیں۔ سوانح نگار کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کن واقعات کا انتخاب کرتا ہے اور ان کو کس انداز میں ترتیب دیتا ہے۔ سوانح میں ادبیت اور حسن ترتیب کے عناصر بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

۴۔ اسلوب یا طرز بیان:۔

اسلوب یعنی طرز تحریر، انداز بیاں، ڈھنگ اور روش انگریزی میں اسلوب کے مترادف کے طور پر لفظ سٹائل" Style "استعمال ہو تا ہے۔ مصنف اپنے خیالات و احساسات کو جس انداز میں تحریر کر تا ہے وہ اسلوب ہے۔ مصنف اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے کے لیے جو طرز تحریر استعمال کر تا ہے وہ اسلوب کہلا تا ہے۔ اسلوب تحریر کا آئینہ ہو تا ہے۔ ہر لکھنے والے کا اپنا انداز بیان یا اسلوب ہو تا ہے اسلوب تخلیق کار کی منفرد شناخت بنانے میں اہم کر دار ادا کر تا ہے۔ جس طرح ہر لکھنے والے کا انداز ایک دوسرے سے مختلف ہو تا ہے اسی طرح ہر مصنف کا اسلوب بھی دوسرے سے مختلف ہو تا ہے۔ ہر صنف ادب کی طرح سوانح عمری کا بھی اپنا مخصوص اسلوب ہو تا ہے۔

سوانح نگار کو نہایت سادہ سلیس اور رواں اسلوب رکھنا چاہیے۔ وہی سوانح عمری ہر اعتبار سے بلند پایہ دلکش اور جاذب نظر ہو گی جس کا اسلوب عمدہ ہو گا اور ایک معیاری سوانح عمری کا اسلوب سادہ اور رواں اور شستہ ہو تا ہے۔ سوانح نگار کو اپنی تخیلاتی اور تخلیقی دونوں قوتوں کو استعمال میں لاتے ہوئے سوانح ترتیب دینی چاہیے اگر وہ ان قوتوں کا استعمال کرے گا تو سوانح جاذب نظر اثر پذیر اور دلکش ہو گی۔ حالات و واقعات کے بیان میں دلچسپی کا عنصر لازمی ہونا چاہیے۔ سوانح ایک ایسے اسلوب میں پروان چڑھائی جائے کہ اس کہانی میں اور جاذبیت ہو سوانح عمری میں اسلوب موقع اور محل کے مطابق تبدیل ہو تا رہتا ہے۔

سوانح نگار کو تحقیقی و تنقیدی انداز بیان اور انداز نظر اپنانا چاہیے۔ سوانح عمری میں صرف واقعات کا انبار نہیں لگا ہو تا بلکہ اس میں واقعات کو بڑی سلیقہ مندی اور ترتیب سے نہایت عمدہ اسلوب میں بیان کیا جا تا ہے۔ سوانح کے اسلوب میں کافی وسعت ہوتی ہے حیات نگار زندگی کے کارناموں اور نجی زندگی کے معاملات کو ایسی جزئیات کے ساتھ بیان کر تا ہے کہ ہیرو کی شخصیت کے تمام خدوخال نمایاں ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہین کے بقول:

''اسلوب جہاں شگفتہ و شاداب ہو وہیں حفظ مراتب کا پورا پورا خیال لیے ہوئے ہو۔ اسلوب ایسا نہ ہو کہ بادی النظر میں محسوس ہو کہ اسلوب کے بل پر شخصیت کو ابھارا جارہا ہے ورنہ شخصیت کے اپنے پاس تو کچھ رکھا نہیں ہے۔''(۴۴)

سوانح میں اسلوب کی اہمیت بہت زیادہ اور بنیادی ہے۔ مواد کی فراہمی کے بعد سلیقے اور ہنر مندی سے ترتیب دینا ہی اصل کمال ہے۔ اگر وافر مقدار میں مواد ہونے کے باوجود سوانح نگار اس کو فن کاری بطور ہنر مندی سے ترتیب نہیں دے سکتا وہ سوانح کبھی بھی معیاری نہیں کہلائے گی۔ مواد کو سلیقے سے پیش کرنا اور اس میں فنی حسن اور دلکشی پیدا کرنا مصنف کا کام ہے۔ سوانح عمری میں خشک اور سنجیدہ اسلوب اپنانے میں تخیل کی فراوانی ہو تو اس میں ڈرامائی پن پیدا ہو جائے تو اس طرح تحریر سطحی ہو جائے گی۔ حقیقت کا بیان عمدہ اسلوب میں کرنا سوانح نگار کا کام ہے۔ سوانحی اسلوب میں خشکی نہیں تازگی ہو۔

ڈاکٹر ممتاز فاخرہ کے بقول:

''فن سوانح میں اسلوب کو بڑی اہمیت ہے اس لیے سوانح نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسا اسلوب اختیار کرے جو موضوع کی خصوصیات اور شخصیت کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔''(۴۵)

سوانح نگار کو مفکرانہ انداز بھی نہیں اپنانا چاہیے بلکہ اس کے انداز بیان اور زبان میں شائستگی ہو۔ اسلوب میں شگفتگی اور شادابی ہونی چاہیے۔ حد سے زیادہ شوخی بھی سوانح حیات کے اسلوب میں نہ پائی جاتی ہو۔ سوانح کا اسلوب پُرکشش اور جاذب نظر ہوتا تاکہ لوگوں کے دلوں میں جادو جگا سکے۔ سوانح نگار کو ادب و آداب کا پورا خیال رکھنا چاہیے۔ حد سے زیادہ شوخی سے پرہیز کرنی چاہیے۔ سوانح عمری میں حقائق کا بیان لازمی ہے مگر ان حقائق کا

بیان ایسے انداز میں ہونا چاہیے کہ تحریر میں ادبی چاشنی پیدا ہو جائے۔ محض سچے واقعات کو بیان کرنا سوانح نگار کا کام نہیں اس طرح صداقت اور سچائی کے بیان سے سوانح میں دلکشی کا عنصر کم ہو جاتا ہے اور تحریر میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے۔ سوانح عمری میں اظہارِ بیان اور اسلوب پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمام واقعات کو خوش اسلوبی سے ترتیب دینا لازمی ہے۔ سوانح نگار کو شخصیت سے ہم آہنگ اسلوب اپنانا چاہیے۔

ڈاکٹر عبد القیوم کے بقول:

"نقادان فن سوانح میں صداقت اور خشک واقعات ہی سے سوانح میں دلچسپی نہیں پیدا کرتے بلکہ اظہار بیاں کی خوبی اور خوش اسلوبی کو بھی بہت دخل ہوتا ہے۔۔۔۔۔ سوانح میں تاریخ فرد واحد اور ادبی چاشنی تینوں کو آمیزش ہوتی ہے اور یہی حسن اس کے حسن کا سبب بن جاتی ہے۔"(۴۶)

سوانح عمری کا ایک مخصوص اسلوب بیان ہوتا ہے۔ سوانح نگار کے اندازِ بیان میں تازگی کی خوبی ہونی چاہیے کیونکہ اگر اسلوب میں خشکی ہو تو وہ قاری کے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کرنے سے قاصر رہے گا۔ اسلوب میں الفاظ کا انتخاب اور ترتیب بڑی سلیقہ مندی سے کرنا چاہیے۔ اسلوب میں ہیرو کے مقام و رتبے کا پورا خیال رکھنا چاہیے اور ادب و احترام کا دامن تھامے چلنا چاہیے۔ سوانح کا اسلوب متوازن اور مناسب ہونا چاہیے۔

۵۔ صداقت کا پہلو:۔

سوانح نگار کو سچائی کا پہلو مد نظر رکھتے ہوئے سوانح عمری لکھنی چاہیے اسے ہیرو سے متعلق کسی بھی طرح کی معلومات بیان کرنے سے پہلے چھان بین کر لینی چاہیے کہ آیا یہ درست ہیں بھی یا نہیں۔ حیات نگار کو واقعات کے مستند ہونے کا یقین ہونے کے بعد تحریر کرنا چاہیے۔ حیات نگار کے لیے لازمی ہے کہ وہ تحقیق و جستجو کا مادہ رکھتا ہو اور

تحقیق سے کام لے۔ حالات وواقعات کو پرکھنے اور چھان بین کے بعد ہی بیان کرے من گھڑت اور جھوٹے واقعات کے بیان سے پرہیز کرے۔ بعض سوانح نگار اپنی تحریر میں چاشنی اور دلچسپی پیدا کرنے کے لیے من گھڑت اور جھوٹے واقعات کا انبار لگا لیتے ہیں ایسا کرنا اصول سوانح نگاری کے خلاف ہے۔ اگر سوانح عمری میں من گھڑت واقعات کی بھرمار ہوگی تو وہ تحریر سطحی اور معیار کے اعتبار سے بھی بلند پایہ نہ ہوگی۔

سوانح نگار کو ہیرو کے روزنامچے یادداشتیں خطوط متفرق تحریریں تقریریں اور تصنیفات جیسے لوازمات سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے تاکہ تحریر کو معیاری اور مستند بنا سکیں۔ سوانح نگار کو مصدق واقعات کا بیان کرکے ہیرو کی زندگی کی تمام حقیقتوں سے پردہ اٹھانا چاہیے تاکہ قاری ہیرو کی زندگی کی تلخ حقیقتوں سے آگاہ ہوسکے۔ زندگی کی ان حقیقتوں سے پردہ اٹھاتے ہوئے اسے سچائی اور انصاف کا دامن تھامے چلنا ہوگا۔

سوانح نگاری کو قصیدہ نگاری کی بجائے ہیرو کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو عبرت کا سامان بناکر پیش کرنا چاہیے۔ ہیرو کو محض ہیرو بناکر پیش نہ کیا جائے۔ ان کی کوتاہیوں اور غلطیوں کو اشکار کرے تب ہی سوانح نگار اپنے فن کے ساتھ انصاف کرسکے گا۔ کوتاہیوں کے بیان کے ساتھ ان خوبیوں کو بھی بیان کرنا چاہیے جو خوبیاں اسے بڑا اور معروف آدمی بناگئیں تاکہ قاری اس سے سبق حاصل کرے۔

الطاف فاطمہ کے بقول:

> ''سوانح نگار کو بڑی کٹھن راہوں اور صبر آزما پابندیوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے وہ یہ کہہ کر ادب میں بلند مقام نہیں حاصل کر سکتا کہ اس تصنیف میں کوئی خاص جدید یا اچھوتا پہلو ہے۔ اس کے لئے جانبدارانہ اور روادانہ مصوری اور عکاسی کا کوئی موقع نہیں وہ شاعر ناول نگار نقاش اور مصور کی طرح آزاد نہیں ہوتا اس کو اپنے طرز نگارش میں سچائی اور دیانت داری کا بڑا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔''(۴۷)

کسی کی کامرانیوں اور ناکامیوں کی سر گزشت بیان کرتے ہوئے ہمیشہ صداقت کا ہاتھ پکڑ کر چلنا چاہیے اور احتیاط برتنی چاہیے۔ سوانح نگار کو سچائی تک پہنچنے کے لیے پوری تگ دو کرنی چاہیے اور اپنی تمام تر توانائیاں صرف کرنی چاہیے۔ مبالغہ آرائی سے اجتناب برتنا بھی سوانح نگار کی ذمہ داری ہے۔ اسے سچی اور غیر جانب دار بات لکھنی چاہیے اور ہیرو کی سچی تصویر کشی کرنی چاہیے۔ ہو بہو وہی تصویر پیش کرنے کی کوشش کرنے چاہیے جیسی کہ وہ شخصیت ہے۔ سوانح نگار کو موافق اور مخالف دونوں پہلوؤں پر منصفانہ نظر رکھنی چاہیے۔ صاف گوئی اور سچائی سوانح نگاری کے اہم پہلو ہیں۔

ملک راشد فیصل کے بقول:

> ''سوانح نگار واقعہ نگار ہوتا ہے اور صاف گوئی اور سچائی اس کی تحریر کے اہم عناصر ہیں۔ اسے ہیرو کی زندگی کے روشن اور تاریک پہلوؤں سے محبت نہیں بلکہ اس کا کام غیر جانبدارانہ اور سچی مرقع کشی ہے۔''(۴۸)

سوانح نگار ترازو کے دونوں پلڑوں میں توازن رکھنا چاہیے اور ایک منصف کی طرح اپنے ہیرو کی تصویر کشی کرنی چاہیے۔ ہیرو کی شخصیت سے جڑے ہوئے ہر اہم پہلو کو بیان کرنا اہم ہے مثلاً ہیرو کا گفتگو کرنے کا انداز، آواز، طریقہ اظہار، رنگ ڈھنگ ان سب پہلوؤں کو شامل کرنا مفید ہے۔ سوانح عمری میں سوانح نگار کو کئی کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اگر وہ صداقت کا دامن تھامے چلے تو تحریر میں جاذبیت پیدا ہو گی اگر وہ جذباتی پن اپنائے گا تو تحریر یک رخی اور ایک طرفہ ہو جائے گی، اس لیے اس جذباتیت سے پرہیز کرنی چاہیے۔

۶۔ غیر جانب داری اور توازن:۔

اعتدال تحریر کا لازمی حصہ ہو تا ہے۔ توازن و تناسب کسی بھی تحریر کا خاصہ ہو تا ہے اسی لیے سوانح کے درمیان جذباتی وابستگی توازن و تناسب میں بگاڑ پیدا کر سکتی ہے یہ ایک حقیقت ہے اس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا چاہے لکھنے والا کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ ادیب ہی کیوں نہ ہو اس پر ہیرو پرستی کے جذبات غالب آنے کا خدشہ رہتا ہی ہے۔ مصنف کو غیر جانب داری سے کام لیتے ہوئے سوانح ترتیب دینی چاہیے کیونکہ جانب دارانہ نقطہ نظر اپنانے سے سوانح میں اثر پذیری پیدا نہ ہو پائے گی۔ مصنف کو منصفانہ اور غیر جانب دارانہ لب و لہجہ اپنانا چاہیے اور ہیرو کی اچھائیوں اور برائیوں کے دونوں پہلوؤں کے درمیان توازن رکھنا چاہیے جانب داری سے پرہیز کرنا بہتر فعل ہے۔ حالات و واقعات اور کارناموں کے بیان میں توازن، اعتدال ضروری ہے۔ اسے نہ تو ہیرو کی اچھائیوں کے بیان میں مبالغہ آرائی سے کام لینا چاہیے اور نہ ہی برائیوں اور کمزریوں کی پردہ پوشی کرنی چاہیے۔ سوانح نگار کے انداز بیان میں توازن نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ غیر ضروری واقعات کے بیان سے گریز کرنا مناسب ہے۔

رفیع الدین ہاشمی کے بقول:

> ''سوانح نگار کا نقطہ نظر، انداز متوازن اور معتدل ہونا چاہیے۔ انداز نظر کے علاوہ سوانح عمری بااعتبار ایک تصنیف کے بھی متوازن اور متناسب ہونا ضروری ہے۔''[۴۹]

سوانح نگار کو اپنی سوانح اثر پذیر بنانے کے لیے متوازن اور منصفانہ انداز اپنانا چاہیے۔ سوانح نگار کو ہیرو سے جذباتی وابستگی کی بنا پر طرف داری کے سیلاب میں نہیں بہنا چاہیے اور نہ ہی مخالفت کے سمندر میں غوطے لگانے چاہئیں بلکہ متوازن انداز اپنانا چاہیے۔ سوانح عمری یک طرفہ نہیں ہونی چاہیے سوانح نگار کو انصاف کا پہلو تھامے ہوئے چلنا چاہیے۔ انصاف پسندی اس کی تحریر کو اثر انگیز اور معیاری بنائے گی۔ سوانح نگار کو اعتدال کی راہ اپنانی

چاہیے تصویر کا صرف ایک رخ پیش نہیں کرنا چاہیے۔ حیات نگار کو اپنے حافظے اور ذہن میں محفوظ معلومات کو بڑی دیانت داری اور غیر جانب داری سے پیش کرنا چاہیے۔ اسے لکھنے کی آزادی ہو تب ہی وہ غیر جانب داری کا مظاہرہ کرے گا۔ شخصیت میں دلچسپی اور لگاؤ سوانح نگار کو ہیرو کے کردار اور شخصیت کا غیر جانب داری سے مطالعہ کرنے پر مجبور کرے گا۔

۷۔ ہمدردانہ نقطہ نظر:۔

سوانح نگار کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اس کا نقطہ نظر اور زاویہ نگاہ ہمدردانہ ہونا چاہیے۔ بے جا عیب جوئی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ہیرو کی کمزوریوں کا بیان کر کے نکتہ چینی کرنے سے تحریر میں یک رخی پیدا ہو جائے تو قاری کے لیے دلچسپی کا باعث نہیں بن سکے گی۔ یہ بات درست ہے کہ اسے خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کا تذکرہ کرنا چاہیے مگر خامیوں کو اچھالنا بھی تو اچھا نہیں۔ سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے دوسروں کی کردار کشی کی اجازت کسی کو کسی صورت نہیں ہوتی۔

حیات نگار کو ہرگز بھی معتصبانہ نقطہ نظر نہیں اپنانا چاہیے۔ سوانح نگار جس شخصیت کا انتخاب کرے اس موضوع میں اس کی دلچسپی لازمی ہے تاکہ وہ اس کے بارے میں جاننے کے لیے تحقیق و جستجو سے کام لیتے ہوئے اپنی پوری دلچسپی سے سوانح تحریر کرے۔ سوانح نگار اگر ہمدردانہ اور عقیدت مندانہ رویہ یا نقطہ نظر نہ اپنائے تو تحریر سرسری اور سطحی ہو جاتی ہے۔ حیات نگار کو ہیرو سے لگاؤ اور ہمدردی تحریر کو معیاری بنانے میں مدد دے گا۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے بقول:

"فی الحقیقت ہمدردی و احترام تقاضائے انسانیت و آدمیت ہے اس لئے اس کے بغیر انصاف ممکن نہیں۔ بہر صورت سوانح نگار ہمدردی و احترام کے ساتھ محدوح کی خامیوں کا ذکر کرے گا تو فی الحقیقت وہ اس کی بشریت ہی کو نمایاں کرے گا۔"(۵۰)

ہمدردی سوانح نگاری کا ضروری عنصر ہے اس پہلو کے بغیر ہیرو کی شخصیت کو سمجھنا مشکل ہے۔ ہمدردی کا مطلب یہ بھی نہیں کہ آپ اپنے ہیرو کی مداح سرائی اور قصیدہ خوانی کرنے لگیں اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے ہیرو کی شخصیت کا غیر جانب داری سے مطالعہ کریں اور اس کی سچی تصویر کشی کریں۔ اس کے علاوہ اختصار، انصاف، مبالغہ آرائی سے اجتناب، آزادیِ خیال، اظہار حقیقت اور غیر جذباتی انداز بھی سوانح نگاری کے فن کے چند اہم پہلو ہیں۔ ایک مشکل فن ہے اور محنت کاوش سے اس میں عبور حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اردو ادب میں سوانح نگاری کے فن نے کئی ارتقائی منازل طے کیے اور وقت کے ساتھ اس فن میں کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اردو ادب میں سوانحی سرمایہ باقی اصناف ادب کی نسبت خاصا کم ہے۔ نئے لکھنے والوں کو بھی اس فن کی طرف توجہ دینا ہوگی یہ فن مزید آگے بڑھ سکے۔

حوالہ جات

۱۔ فیروز الدین، مولوی، الحاج، ''فیروز اللغات'' فیروز سنز لاہور، بار اول ۲۰۱۰ء، ص ۸۱۷

۲۔ مقبول بیگ بدخشانی، مرزا، ''اردو لغت'' اردو سائنس بورڈ، لاہور، بار دوم، ۱۹۸۸ء، ص ۲۳۶

۳۔ صدف نقوی، ''گوہر ادب'' مثال پبلشرز امین پور بازار، فیصل آباد، اشاعت دوم، ۲۰۱۵ء

۴۔ عبد الحق، مولوی، ڈاکٹر، بابائے اردو ''انجمن کی اردو انگریزی لغت'' انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، طبع چہارم

۱۹۸۷ء، ص ۳۹ ۷

۵۔ نجیب رامپوری، ''نئی اردو لغت'' (جامع) فرید بل ڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ، ۲۰۰۴ء

۶۔ ج۔ ع۔ واجد، ''فرہنگ ادبیات اردو'' ایس ایچ آفسیٹ پرنٹرس دہلی، دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۱ء، ص ۸۷ ۳

۷۔ رفیع الدین ہاشمی، ''اصناف ادب'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۱۶۰

۸۔ مظہر مہدی، ''بیسویں صدی میں اردو کا سوانحی ادب، مشمولہ، بیسویں'' صدی میں اردو ادب'' مرتب گوپی چند

نارنگ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۳۲۹

۹۔ امیر اللہ خان شاہین، ڈاکٹر، ''فن سوانح نگاری''، طاہر بک ایجنسی دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۱۲۹

۱۰۔ گیان چند، ڈاکٹر، ''ادبی اصناف'' گجرات اردو اکادمی گاندھی نگر پہلا ایڈیشن ۱۹۸۹ء، ص ۱۳۷

۱۱۔ الطاف فاطمہ، ''اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا'' اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی پہلا ایڈیشن ۱۹۷۴ء، ص ۱۹

۱۲۔ وہاج الدین علوی، ''اردو خود نوشت فن و تجزیہ'' جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ۱۹۸۹ء، ص ۳۰

۱۳۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر، ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، ''کشاف تنقیدی اصلاحات''، مقتدرہ قومی زبان،

اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

۱۴۔ وہاج الدین علوی، ''اردو خود نوشت فن و تجزیہ'' جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ۱۹۸۹ء، ص ۴۱

۱۵۔ صبیحہ انور، ڈاکٹر، ''اردو میں خود نوشت سوانح حیات'' نامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۲ء، ص ۴۳

۱۶۔ وہاج الدین علوی، ''اردو خود نوشت فن و تجزیہ''، ص ۳۲

۱۷۔ منصف خان سحاب، ''نگارستان'' مکتبہ جمال لاہور ۲۰۱۰ء، ص ۳۵۸

۱۸۔ شاہ علی سید، ڈاکٹر، ''اردو میں سوانح نگاری'' انجمن پریس لارنس روڈ، کراچی ۱۹۶۱ء، ص ۳۹

۱۹۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، ''سوانح نگاری کیا ہے'' مشمولہ ''اردو نثر کا فنی ارتقا'' مرتب ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ۱۹۹۷ء،

ص ۳۲۵

۲۰۔ ممتاز فاخرہ، ڈاکٹر، ''اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا'' (۱۹۱۴ تا ۱۹۷۵) رونق پبلشنگ ہاؤس دہلی پہلا ایڈیشن

۱۹۸۴، ص ۵۰

۲۱۔ راشد فیصل ملک، ''حالی کی سوانح نگاری'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۷ء، ص ۳۳

۲۲۔ الطاف فاطمہ، ''اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا''، ص ۲۸

۲۳۔ راشد فیصل ملک، ''حالی کی سوانح نگاری''، ص ۴۱

۲۴۔ رفیع الدین ہاشمی، ''اصناف ادب''، ص ۱۶۴

۲۵۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، ''تنقیدی نقوش'' مشتاق بک ڈپو کراچی، ص ۱۲

۲۶۔ ممتاز فاخرہ، ڈاکٹر، ''اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا''(۱۹۱۴ تا ۱۹۷۵)، ص ۶۲

۲۷۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، ''تفہیم و تجزیہ'' کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ جامع پنجاب، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۸۱

۲۸۔ اعجاز حسین سید، ڈاکٹر، ''مختصر تاریخ ادب اردو'' اردو اکیڈمی سندھ کراچی تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۱، ص ۳۱۸

۲۹۔ ممتاز فاخرہ، ڈاکٹر، ''اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا''(۱۹۱۴ تا ۱۹۷۵) ، ص ۶۷

۳۰۔ ایضاً، ص ۸۶

۳۱۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، ''اردو سوانح نگاری''، مشمولہ: خیابان، اصناف نثر نمبر شعبہ اردو جامعہ پشاور، ۱۹۹۵،

ص ۲۴۷

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۴۸

۳۳۔ ممتاز فاخرہ، ڈاکٹر، ''اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا'' ، ص ۱۹۱

۳۴۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، ''تفہیم و تجزیہ''، ص ۹۲

۳۵۔ الطاف فاطمہ، ''اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا''، ص ۱۹

۳۶۔ گیان چند، ڈاکٹر، ''ادبی اصناف''، ص ۱۳۷

۳۷۔ امیر اللہ خان شاہین، ڈاکٹر، ''فن سوانح نگاری''، ص ۲۴

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۳۱

۳۹۔ امیر اللہ خان شاہین، ڈاکٹر، ’’فن سوانح نگاری‘‘، ص ۱۳۵

۴۰۔ رفیع الدین ہاشمی، ’’اصناف ادب‘‘، ص ۱۶۳

۴۱۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، ’’سوانح نگاری کیا ہے‘‘، ص ۳۲۱

۴۲۔ الطاف فاطمہ، ’’اردو میں سوانح نگاری کا ارتقا‘‘، ص ۱۹

۴۳۔ امیر اللہ خان شاہین، ڈاکٹر، ’’فن سوانح نگاری‘‘، ص ۱۲۴

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۴۵

۴۵۔ ممتاز فاخرہ، ڈاکٹر، ’’اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا‘‘، ص ۱۳۸

۴۶۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، ’’سوانح نگاری کیا ہے‘‘ ص ۳۲۰

۴۷۔ الطاف فاطمہ، ’’اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا‘‘، ص ۱۷

۴۸۔ راشد فیصل ملک، ’’حالی کی سوانح نگاری‘‘، ص ۲۱

۴۹۔ رفیع الدین ہاشمی، ’’اصناف ادب‘‘، ص ۱۶۲

۵۰۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، ’’اردو سوانح نگاری‘‘، ص ۲۵۷

باب دوم:

"راہِ رواں" کا فکری مطالعہ

ا۔ "راہِ رواں" مختصر تعارف:۔

"راہِ رواں" بانو قدسیہ کی وہ تصنیف ہے جس میں انہوں نے اپنے شوہر اشفاق احمد کی سوانح کو تحریر کیا ہے یہ ایک ضخیم کتاب ہے ۔ بانو قدسیہ کی متعدد تصانیف ہین لیکن سوانح کے موضوع پر یہ اُن کی پہلی تصنیف ہے۔بحیثیت ادیب بانو قدسیہ ایک خاص مقام رکھتی ہیں لیکن بحیثیت سوانح نگار یہ اُن کی ادبی جہات میں سے ایک نئی جہت ہے۔بانو قدسیہ کی اس تصنیف کے تجزیے کے ذریعے بحیثیت سوانح نگار اُن کے مقام کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ اس تصنیف کے فکری اور فنی زاویوں کو بھی موضوع بنایا جائے گا۔

"راہِ رواں" کو اٹھارہ عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان عنوانات کے ذریعے بانو قدسیہ نے اشفاق احمد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔ سوانح چونکہ کسی ایسی شخصیت پر لکھی جاتی ہے۔ جسے آپ پوری طرح جانتے ہوں یا اس شخصیت کی زندگی کے حوالے سے آپ کے پاس مستند مواد موجود ہو۔ بانو قدسیہ اور اشفاق احمد ازدواجی رشتے میں منسلک تھے اس لیے بانو قدسیہ اگر اشفاق احمد کی شخصیت منتخب کرتی ہیں اور یقیناً وہ ایسا خیال کرتی ہوں گی کہ وہ اُن کی زندگی کے بارے میں تمام معلومات رکھتی ہیں۔

بانو قدسیہ یہ سوانح لکھنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''میں نے بھی ایک معمولی سی کوشش خان صاحب کو آپ سے روشناس کرانے کی خاطر کی ہے۔''(۱)

بانو قدسیہ خود اس بات کا اقرار کرتی ہیں کہ سوانح نگاری ایک مشکل فن ہے اور اس کے لیے مصنف کو تمام معلومات ہونی چاہئیں۔ وہ اس بات کا اقرار کرتی ہیں کہ کوئی بھی انسان اپنی ذات کو دوسروں پر مکمل عیاں نہیں کرتا۔ ہر انسان کی یہ کوشش رہتی ہے کہ اس کی ذات کے پوشیدہ گوشے پوشیدہ ہی رہیں کسی پر عیاں نہ ہوں۔

''راہِ رواں'' کے آغاز میں بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

''جب بھی کوئی سوانح نگار بائیو گرافی لکھتا ہے یا کسی شخص کی زندگی کی جگ سو پزل تیار کرتا ہے تو اُسے بہت سی ٹکڑیاں غائب ملتی ہیں۔ پُورا ڈیٹا نہ ہونے کے باعث نہ کوئی تیار شدہ ماسٹر پلان ہوتا ہے نہ کوئی روڈ میپ ہی، جس پر چل کر ہم اُس کی بلاو نگاری کر سکیں۔ تاریخ اور سوانح نگاری کے انٹرویوز صاحب ذکر کی کتابیں، موصوف کے خاندان کے لوگوں سے ''سی آئی اے''، قسم کی چھان بین، ملازموں کی جانچ پڑتال کام آتی ہیں۔ لیکن بائیو گرافی پھر بھی نامکمل، حواشی کی محتاج اور صورت گری کے دھندے پن میں متتنبع ہوتی ہے۔''(۲)

بانو قدسیہ کو اشفاق احمد سے بے انتہا محبت اور لگاؤ تھا جس کی وجہ سے ''راہِ رواں'' کو پڑھتے ہوئے بہت سے مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بانو قدسیہ اشفاق احمد سے بہت متاثر تھیں اور ''راہِ رواں'' اشفاق احمد کی سوانح سے زیادہ ایک نثری قصیدہ معلوم ہوتا ہے۔ بانو قدسیہ خود کو اُن کے احسانات کے نیچے دبا ہوا محسوس کرتی ہیں اور اُن احسانات کا بدلہ چکانے کے لیے وہ ''راہِ رواں'' جیسی تصنیف تخلیق کرتی ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتی ہیں۔

"میں بھی اپنے طور پر اُن کی مہربانیوں شفقت اور شاگردی کا حق ادا کرنا چاہتی ہوں ۔"(۳)

سوانح نگار کے لیے غیر جانبداری سے کام لینا بہت ضروری ہے اگر سوانح نگار جانبدار ہو جائے گا وہ اس صنف سے انصاف نہیں کر پائے گا۔ "راہِ رواں" کو پڑھتے ہوئے ایسا احساس ہوتا ہے کہ بانو قدسیہ کا مقصد سوانح لکھنے کے ساتھ ساتھ ایک باوفا بیوی ہونے کی حیثیت سے شوہر کی شخصیت کو دیوتا بنا کر پیش کرنا بھی تھا۔ سوانح کے فن کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے "راہِ رواں" کا تجزیہ کیا جائے تو یہ پہلے مرحلے پر ہی سوانح کی خصوصیات سے عاری نظر آتی ہے۔ سوانح نگار کے لیے دوسری اہم بات واقعات کو صحت کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ اگر واقعات میں صداقت نہیں ہو گی یا ابہام ہو گا تو پھر وہ تحریر سوانح کی ذیل سے خارج ہو جائے گی۔ واقعات کی صحت کے حوالے سے بانو قدسیہ رقم طراز ہیں۔

"میں عموماً سنی سنائی پر ایمان لے آتی ہوں میں سرہن زادوں کی طرح حکم مان کر اٹھ نکلتی ہوں۔"(۴)

ایک اور جگہ بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

"میں جو کچھ سنی سنائی جانتی وہی گوش گزار کر سکتی ہوں۔ لمبے ساتھ کی وجہ سے بہت کچھ جان گئی ہوں لیکن مجھے بخوبی علم ہے کہ ہر انسان سربستہ راز ہے حتیٰ کہ وہ خود بھی اپنے وجود سے کلی طور پر آگاہ نہیں ہوتا۔ صرف عرفانِ ذات کے ماہر صوفی واقعی بڑی سہولت سے اپنے آپ کو جان کر اپنے رب کو پہچان لیتے ہیں لیکن یہ کسی نصیب والے کو آگاہی ملتی ہے کہ عرفانِ ذات ہی عرفانِ حق ہے۔"(۵)

واقعات کی کمزور صحت پر ایک اور اقتباس دیکھیے:

"اشفاق احمد کے بڑے پنچوں نے فیصلہ کیا کہ وہ افغانستان چھوڑ کر ترائی کی جانب پنجاب کی طرف جابسیں۔ خدا جانے مہمند قبیلہ جتھوں کی شکل میں عازم سفر ہوا کے چھوٹے چھوٹے خاندان اپنا اثاثہ باربرداز جانوروں پر لاد مشکل راستوں سے ہو کر مختلف جغرافیائی حدود میں ہونٹ سکیڑے کچھ اداس، کچھ پُر امید، کچھ ہراساں چلتے چلتے پنجاب میں آبسے۔"(۶)

بانو قدسیہ ایک اور جگہ کچھ یوں لکھتی ہیں:

"میں یہ باتیں آپ کو کسی طور پر کسی دعویٰ کے ساتھ پیش نہیں کررہی۔ یہ ساری سنی سنائی منہ در منہ کی کہانیاں ہیں۔ سارے بہن بھائی ایک ہی کہانی مختلف انداز، لب ولہجہ اور بناوٹ میں سناتے تھے لیکن ہر ایک کے لہجے میں وہی تفافر دلاویزی اور تازگی ہے۔ اس سارے خاندان کو اپنے دادا دوست محمد خان کے حُسن پر ناز اور اپنے پیر زادے ہونے پر فخر ہے۔"(۷)

سنی سنائی، خدا جانے، معلوم نہیں جیسے الفاظ شک میں مبتلا کرتے ہیں اور پیش کیے گئے واقعات کی صحت کو مشکوک کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر اقلیمہ ناز اس ضمن میں لکھتی ہیں:

"میرے خیال میں " راہِ رواں" میں پیش کی گئی معلومات اُن کی آنکھوں دیکھی ہیں جیسا کہ آنکھوں نے دیکھا ویسا ہی پیش کر دیا۔ سوائے ایک دو واقعات کے جو شاید اُن کی عمر کے تقاضے کے باعث درست قلم بند نہ ہو سکے۔"(۸)

ڈاکٹر اقلیمہ ناز کے اس بیان سے اتفاق ممکن نہیں کیونکہ بانو قدسیہ خود متعدد مقامات پر واقعات کی صداقت کے حوالے سے رائے دیتی نظر آتی ہیں۔ ان بیانات کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا قدرے آسان ہو جاتا ہے کہ ''راہِ رواں'' سوانح ہے یا کچھ اور۔ ''راہِ رواں'' میں سوانح کی دونوں بنیادی خصوصیات ناپید نظر آتی ہیں۔ بانو قدسیہ نے اگر یہ سوانح تحریر کی ہے تو شاید وہ اس سے انصاف نہیں کر سکیں۔ ان کی جانبداری ہر جگہ غائب نظر آتی ہے۔ وہ چاہ کر بھی اس سے بچ نہیں سکیں۔ اس کے علاوہ ''راہِ رواں'' کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ سوانح سے زیادہ کوئی آپ بیتی پڑھ رہے ہیں۔ بانو قدسیہ نے سوانح اور آپ بیتی کی ایک ملی جلی شکل ہمارے سامنے پیش کی ہے۔

ڈاکٹر اقلیمہ کہتی ہیں:

> ''انہوں نے سوانح کے ساتھ ساتھ آپ بیتی بھی لکھ دی کیونکہ اس میں انہوں نے نہ صرف اشفاق احمد کی سوانح کے متعلق لکھا بلکہ اپنی زندگی کی باریکیوں کو بھی تفصیلاً پیش کر دیا۔''[۹]

'' راہِ رواں'' سوانح ہے یا آپ بیتی اس سے قطع نظر ایک اور بڑی خامی اس کی طوالت اور تکرار ہے۔ بانو قدسیہ ایک ہی واقع کو بار بار لکھتی ہیں جس سے قاری اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے۔

نثر میں کسی واقعے کی تکرار بڑا عیب سمجھی جاتی ہے۔ لیکن بانو قدسیہ اپنی فیملی اور خان صاحب کی فیملی کی تعریف و خوشامد اتنی زیادہ تکرار سے کرتی نظر آتی ہیں کہ قارئین اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور انکے خاندان سے بیزار ہونے لگتا ہے۔ ایک بات کی تکرار ناقص انداز تحریر پر دلالت کرتی ہے۔ بانو قدسیہ نے اپنے بیٹے اثیر کی بیماری کا واقعہ بھی کتاب میں بار بار بیان کیا ہے حالانکہ ایسی بے جا تکرار، بے جا خوشامد، بے جا تعریف، بے جا مبالغہ آرائی سے دونوں خاندانوں کی ساکھ کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ قصیدہ گوئی، خوشامد اور مبالغہ آرائی کے بھی کچھ آداب،

اصول ہوتے ہیں۔ کم از کم بانو قدسیہ فنی لوازمات کا تو خیال رکھتیں۔ تکرار سے کام نہ لیتیں تو وہ اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب نظر آتیں۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی تعریف میں جن لوگوں نے مضامین لکھے وہ بھی مصنفہ نے اس کتاب میں شامل کر دیئے۔ جو خوبیاں مصنفہ نے خان صاحب کی تحریر کیں وہی خوبیاں دوسرے غیر معروف ادیبوں کے مضامین میں بھی نظر آئیں اور تکرار کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ جس سے قاری کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ یہ تعریفی مضامین خود کسی سے لکھوائے گئے ہیں۔

ڈاکٹر اقلیمہ ناز اس ضمن میں لکھتی ہیں:

"بانو قدسیہ کا اسلوب رواں اور شستہ ہے۔ البتہ بعض واقعات کی تکرار سے کئی صفحات پلٹنے پڑتے ہیں۔"(۱۰)

۲۔ اشفاق احمد کا خاندان:۔

سوانح کے لیے شخصیت کا انتخاب ایک اہم مرحلہ ہوتا ہے جب آپ کسی ایسی شخصیت کا انتخاب کرتے ہیں جس سے آپ کا نہ صرف قریبی تعلق ہوتا ہے بلکہ آپ کی اُس سے جذباتی وابستگی بھی ہوتی ہے تو آپ اُس سے پوری طرح انصاف نہیں کر پاتے۔ بانو قدسیہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا نظر آتا ہے۔ بانو قدسیہ کی اشفاق احمد سے محبت اور جذباتی وابستگی انہیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر اقلیمہ کے بقول:

" راہِ رواں" سوانح کی صنف کی روایت سے ذراہٹ کر ہے۔ کیونکہ اس میں نہ صرف کسی دوسرے شخص کی سوانح کو پیش کیا بلکہ اپنی زندگی اور خاندانی معاملات کو بھی

دھڑک پیش کرتی گئیں۔ جس کی وجہ سے یہ سوانح نگاری اور آپ بیتی کا ایک ملغوبہ بن کر رہ گئی۔"[۱۱]

جہاں تک اشفاق احمد کے خاندان کا تعلق ہے مصنفہ نے بہت تفصیل کے ساتھ اشفاق احمد کے خاندان کا ذکر کیا ہے۔ بانو قدسیہ شادی سے پہلے اُن کے خاندان کو نہیں جانتی تھیں۔" راہِ رواں" میں اشفاق احمد کے خاندان کے حوالے سے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ سنی سنائی باتوں کے علاوہ کچھ نہیں لیکن بانو قدسیہ کا یہ کمال ہے کہ اُنہوں نے ان واقعات اور معلومات کو بھرپور تفصیل سے تحریر کیا ہے۔

بانو قدسیہ کے بقول:

"سارے بہن بھائی ایک ہی کہانی کے مختلف انداز، لہجہ اور بناوٹ میں سناتے تھے لیکن ہر لہجے میں وہی تفافر، دلاویزی اور تازگی ہے۔"[۱۲]

بانو قدسیہ اشفاق احمد کے خاندان کی تفصیل اس لیے بیان کرتی ہیں تاکہ خان صاحب کی شخصیت پر موروثی اثرات کا جائزہ لیا جاسکے جبکہ تمام خاندانی معلومات صرف سنی سنائی ہیں۔ خاندانی معلومات کے حوالے سے مصنفہ نے کوئی ٹھوس تحقیقی انداز اختیار نہیں کیا بلکہ مبالغہ آمیزی اور افسانوی طریقے سے خاندان کی قصیدہ نگاری کی ہے۔ کیا خان صاحب کے خاندان میں عام انسانوں کی طرح خامیاں نہیں تھیں؟ اُن خامیوں اور کمزوریوں کا ذکر کتاب کے ایک جملے میں بھی نہیں ملتا۔ مصنفہ نے سچائی کھرے پن کی بجائے وضع داری اور رکھ رکھاؤ کا مظاہر کیا۔ خاندان کے تمام افراد نے کامیاب دنیادار کی طرح زندگی گزاری۔ لیکن کتاب میں انہیں نیک، پارسا اور ساری انسانی صفات سے مزین کر کے فرشتوں کے روپ میں پیش کیا گیا۔

ممتاز مفتی کہتے ہیں:

”بانو بہت بڑی مفکر ہے۔ وہ ہر بات میں صاحبِ رائے ہے۔ عقل و خرد سے بھرپور ہے لیکن جب اشفاق طلوع ہوتا ہے تو سب کچھ سپاٹ ہو جاتا ہے۔ عقل و خرد اور دانش وری۔ “(۱۳)

سوانح نگاری کے فن کی بنیادی خصوصیت بے لاگ اور دو ٹوک انداز بیاں ہے۔ لیکن خاندانی تفصیلات دیتے ہوئے مصنفہ صرف اشفاق احمد کے خاندان کی شہرت، نیک نامی اور سماجی رتبے میں اضافے کی خواہش مند نظر آتی ہیں۔ تاریخ میں اس خاندان کا نام معزز خاندانوں میں لکھوانے کی شعوری کوشش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بانو قدسیہ پر اشفاق احمد کے خاندان نے جو احسانات کئے۔ جتنے فائدے مصنفہ کو پہنچائے۔ مصنفہ نے اپنے محسن خاندان کے احسانات اور بھلائیوں کا صِلہ دینے کی کوشش کی ہے۔ کیا سوانح نگار حقائق اور تصویر کا ایک رُخ پیش کرنے کے بعد کامیاب سوانح نگار کہلا سکتا ہے؟ فکری طور پر اس سوانح کی سب سے بڑی خامی بے لاگ سچائی بیاں کرنے سے گریز ہے۔ تمام قارئیں جب اس سوانح کا مطالعہ کریں گے تو وہ اشفاق احمد کو دیوتا اور اُن کے خاندان کو ”مقدس فرشتے“ قرار دیں گے۔ اردو ادب کے نقاد، محقق اور ادیب جب اس سوانح کا مطالعہ کریں گے تو انہیں بانو قدسیہ کی یہ سوانح فکری طور پر خوشامد، مبالغہ آمیزی، خود ستائی، قصیدہ نگاری، افسانہ نگاری اور داستان طرازی کا مجموعہ نظر آئے گی۔

بانو قدسیہ اشفاق احمد کے خاندان کا ذکر کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ اُن کا خاندان ہجرت کر کے آیا تھا اور جس طرح ہجرت کرنے والے مختلف مسائل کا شکار ہوتے ہیں۔ مصیبتیں اور صعبتیں برداشت کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے خاندان نے بھی بہت مشکلات برداشت کیں۔

''اُن کے پر کھ جب ہجرت کر کے پنجاب میں پہنچے تو تمام اقلیتوں کی طرح انہوں نے اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے مُٹھی بن معاشرہ قائم کیا۔ یہ لوگ نہ مداخلت کرتے تھے نہ مداخلت برداشت کرتے تھے۔ انتہا کے مہمان نواز لیکن دوستی کو دستر خوان سے آگے نہ بڑھنے دیتے۔ میل جول میں اس درجہ محتاط کہ ذات برادری سے باہر شادی کا تصور ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہی تضاد اندر ہی اندر خان صاحب کو دیمک کی طرح چاٹنے لگا۔''[۱۴]

اشفاق احمد کو اپنی شناخت قائم رکھنے اور نئے ماحول میں خود کو ڈھالنے میں کافی مشکلات کا سامنا رہا۔ بانو قدسیہ نے نئے اور پرانے کلچر کی بحث کو بہت مختصراً بیان کیا ہے۔

بانو قدسیہ کے بقول:

''جناب اشفاق احمد مہمند پٹھان تھے۔ وہ اپنی شناخت کو چھپاتے تھے۔ پاکستان بننے سے پہلے انہوں نے اپنے نام کے ساتھ خان لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ پاکستان مسلمانوں کا دید ہو گا۔ وہاں نہ بنی۔ نہ علاقائی زبانوں ہی کا تفافر ہو گا۔ یہ دھرتی مہاجر اور انصار کی سانجھی ہو گی اور انصاف کے تحت چلنے والا نظام رائج ہو گا۔''[۱۵]

بانو قدسیہ نے مہاجروں کی نفسیات کا جائزہ لیا ہے۔ مہاجر اپنی انا، شناخت اور عزت نفس کا تحفظ چاہتا ہے۔ مقامی کلچر میں جذب نہیں ہونا چاہتا۔ مقامی کلچر سے اپنے کلچر کو کم تر نہیں سمجھتا۔ جبکہ مہاجر پٹھان اظہار کے پکے فنون لطیفہ میں پناہ لیتا ہے اور عظیم تخلیق کار بن جاتا ہے۔

۳۔ اشفاق احمد کا بچپن:۔

اشفاق احمد کا بچپن بھی دیگر بچوں کی طرح شرارتوں سے بھرپور تھا۔ بانو قدسیہ نے اشفاق احمد کے بچپن کے حالات بیان کرتے ہوئے ان کی طبیعت میں موجود شوخی اور شرارتی پن کو بیان کیا ہے۔ بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر اشفاق احمد شرارتوں میں سب سے پہلے ہوتے تھے۔ کبھی ٹیلی فون کا کنکشن چوری کر کے غلط اطلاعات ادھر اُدھر پہنچاتے اور کبھی چوری کر کے بم بنانے جیسی تدابیر میں اشفاق صاحب شامل ہوتے۔

بانو قدسیہ اس ضمن میں لکھتی ہیں:

''اسحٰق بھائی نے سوچا کہ بم بنانا چاہیے۔ اس بم کا معرف کیا ہو گا۔ یہ انہوں نے نہ سوچا۔ ایک طبعی سائنسدان کی طرح انہیں صرف بم کی ایجاد سے غرض تھی۔ اب گھریلو بم کے لیے منچھل پٹاس اور پارے کی ضرورت تھی۔ منچھل پٹاس تو بازار سے مہیا کی جاسکتی تھی لیکن پارہ کمیاب بھی تھا اور اس کے خریدنے کی سپلی بھی نہ تھی۔ سکول میں سائنس لیبارٹری میں تقریباً دو سیر پارہ پڑا تھا۔ اب یہ سوچنا کہ پارہ وہاں سے کیسے اڑایا جائے؟ بڑے بھائیوں سے بات چیت مشکل تھی۔ اشتیاق ابھی چھوٹا اور بے سمجھ تھا۔ طے یہ ہوا کہ خاں صاحب اور کوٹ پہن کر جائیں اور پارہ لیبارٹری کی بوتل سے چرا کر کوٹ کی جیب میں ڈالیں اور گھر لے آئیں۔ جب شقو اور کوٹ پہن کر سکول پہنچے تو سب حیران کہ اتنی گرمی میں یہ کوٹ کیوں؟ بہانہ بھی پہلے تراش کر دیا گیا تھا۔ خاں صاحب نے سب سے کہا کہ ملیریا بخار ہے بہت سردی لگ رہی ہے۔ مشکل سے لیبارٹری تک رسائی ہوئی۔ پارہ کوٹ کی جیب میں ڈال کر چوروں کی طرح باہر نکلے۔''(۱۶)

بچپن میں اشفاق احمد اور تقو اپنے بھائی ججو صاحب کی باتیں مانتے تھے اور ان کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ اقبال بھائی کے ساتھ ان کی شرارتوں میں شریک رہتے تھے۔ اشفاق احمد اپنے دادا سے بہت مشابہ تھے۔اُن کی شکل وصورت اتنی دادا جی سے ملتی تھی ایسا لگتا تھا دادا جی دوبارہ دنیا میں آ گئے۔اُنہیں بابا دوست محمد کا حافظہ ملا تھا۔ بانو کہتی ہیں کہ سنا ہے اشفاق احمد جس دن پیدا ہوئے اُن کے دادا اُس دن فوت ہوے اور انہوں نے جانے سے پہلے اپنی وراثت Genes کی شکل میں اشفاق احمد کو سونپ دی۔ اشفاق احمد کو تعلیم وتربیت کے لیے اسلامیہ دینی مدرسہ میں داخل کرایا گیا۔ یہ سکول مسجد میں بنا ہوا تھا یہاں پر اشفاق احمد نے بچپن میں ہی بہت سے دینی مسائل یاد کر لیے تھے۔

بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

> ''اس سکول میں ٹاٹوں پر بیٹھے قلمیں گھڑ کے دوات میں پکڑے سوف ڈال کر کالی سیاہی بنا کر قلم سے لکھا جاتا۔ خاں صاحب کو تختی پر لکھنا، تختی کو دھو کر گاچی مل کر صاف کرنے کے لیے سکھانا بڑے تخلیقی عمل لگتے۔''(۱۷)

اشفاق احمد صاحب پانچویں جماعت میں پہنچے تو اُن کو انگریزی سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ اشفاق صاحب جب چھوٹے تھے تو اُن کے گھر میں الگ ملازم ہوتا تھا جو کہ بھینسوں کو سنبھالتا تھا اس لئے بھینسوں کو سنبھال سنبھال کر اُسے اتنا پتا لگ گیا کہ یہ بھینس کس قسم کی ہے۔ دور سے آئی بھینس دیکھ کر بتا دیتا تھا کہ یہ بھینس کس کی ہے۔ اس کے علاوہ بارش کے متعلق بھی جو کچھ بتاتا وہ بھی ٹھیک نکلتا۔

بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

''چھوٹی عمر میں خاں صاحب اس حقیقت سے دوچار ہو گئے کہ پڑھے لکھوں کا علم اپنی جگہ لیکن دانش و فراست میں تجربے اور زندگی سے سیکھنے کے عمل میں ان پڑھ بھی اپنا ایک جداگانہ علم اور مقام رکھتے ہیں۔''(۱۸)

دسویں جماعت مکتسر میں کرنے کے بعد اشفاق احمد اپنی بہن فرحت کے پاس فروز پور چلے گئے۔ وہاں پر اشفاق احمد کو رام سکھ داس کالج میں داخل کروا دیا گیا۔ اشفاق احمد مکتسر میں اپنے بھائی ججو کے ساتھ تالاب پر تیرنے کے لیے جاتے تھے۔ اُن کا بھائی تقو ہر وقت اُن کے ساتھ ساتھ رہتا تھا اور سوتا بھی اشفاق احمد کے ساتھ ہی تھا لیکن جب خاں صاحب اپنے بھائی ججو کے ساتھ صبح تیرنے کے لیے جاتے تو اُسے سوتا چھوڑ جاتے تھے۔ تقو کو اُن کے اس رویے سے بہت دکھ ہوتا تھا۔ تقو نے آخر کار ایک ترکیب سوچی وہ رات میں اپنا ازار بند اُن کی کمر سے باندھ کے سوتا تھا جب وہ صبح جاگتے تو تقو اٹھ جاتا اور ساتھ جانے کی ضد کرتا تھا۔ اگر اشفاق احمد نہ لے جاتے تو دھمکی دیتا کہ اگر مجھے ساتھ نہ لے گئے تو بابا جی کو بتا دوں گا، اشفاق احمد تقو کو ساتھ لے جاتے اور جلد ہی تقو ان دونوں سے اچھا تیراک بن گیا۔

بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

''یوں تو ہر شخص پر بچپن کی چھاپ گہری ہوا کرتی ہے لیکن خاں صاحب اپنے اس آبائی وطن کو کبھی نہ بھولے۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر وہ کہیں اور پروان چڑھے ہوتے تو شاید اُن کی تخلیقی قوتوں کو یوں پھننے کا موقع نہ ملتا۔ وہ ساری عمر اپنے اسی بچپن کی شکر گزاری میں مبتلا رہے جس نے انہیں کچھ باتیں ذہن نشین کرا دیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ عام انسان کے اس قدر قریب نہ رہے ہوتے تو وہ کبھی سمجھ نہ پاتے کہ غریب آدمی کا بنیادی مسئلہ ضروریات زندگی

کی فراہمی ضرور ہے۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ "عزتِ نفس" ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر عام آدمی کو روٹی، کپڑا اور مکان میسر آجاتا ہے لیکن وہاں عزت نفس نہیں ملتی تو وہ بظاہر زندہ رہتا ہے لیکن اندر سے مر جاتا ہے۔" (۱۹)

اشفاق احمد بچپن میں عام اور غریب انسان نوں کے قریب رہے۔ اس لیے انہیں اسلام، پاکستان اور عام آدمی سے عشق تھا۔ وہ عام آدمی کی عزتِ نفس کی بحالی چاہتے تھے۔

۴۔ اشفاق احمد کی ازدواجی زندگی:۔

اشفاق احمد شرمیلے اور غیرت مند پٹھان تھے۔ محبت کے اظہار کے معاملے میں گونگے تھے۔ وہ مصنفہ کے ساتھ تعلق بڑھانے کے خواہش مند بھی تھے اور خوف زدہ بھی تھے۔ اشفاق احمد کی شخصیت کا یہ ایک تضاد تھا۔ بانو قدسیہ کو اشفاق احمد کتابیں پڑھنے کے لیے دیتے۔ کتابوں کا تبادلہ کرتے۔ ادھار مانگ کے واپس نہ کرتے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے آپ کو بوڑھا ظاہر کرتے کہ لڑکیاں متوجہ نہ ہوں۔ مصنفہ خود بھی محبت کے اظہار کے قابل نہ تھیں۔ دونوں طرف یہ امید بندھی تھی کہ دوسرا فریق محبت کا اظہار کرے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اشفاق احمد تحفے وصول کرنے اور فرمائشیں کرنے میں ماہر تھے۔ مصنف کے نزدیک یہ اُن کی انکساری تھی۔ اشفاق احمد بانو قدسیہ کے گھر آتے۔ اُن کے افسانے اور البم دیکھتے، گپ شپ کرتے۔ اپنے چھوٹے بھائی اشتیاق احمد کو بھی ساتھ لاتے رہے۔ اس لیے مصنفہ اور اشفاق احمد کا بھی قریبی تعلق رہا۔ بانو قدسیہ کا پہلا افسانہ "واماندگی شوق" ادب لطیف میں اشفاق احمد نے شائع کرایا۔

بانو قدسیہ کے بقول:

''میری شادی ہمارے دونوں گھر والوں کے لیے ایک لا ینحل مسئلہ تھا۔ خاں صاحب کے خاندان والے روایات کے پابند سکندری طبیعتوں کے مالک، خود اعتماد لوگ تھے۔ اُن کے خاندان میں کبھی کسی نے روایات توڑ کر باہر کی کسی لڑکی سے شادی کا سوچا بھی نہ تھا۔''(۲۰)

اشفاق احمد کسی انسان کی دل آزاری کے سخت خلاف تھے۔ وہ دل شکنی کو دنیا کا سب سے بڑا جرم سمجھتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو علم ذہانت کے لحاظ سے کم تر ظاہر کرتے تھے۔ وہ نہ ہی مصنفہ کی دل آزاری کرنا چاہتے تھے نہ ہی گھر والوں کی دل شکنی۔ اسی کشمکش کی وجہ سے وہ روم چلے گئے۔ مصنفہ کے ساتھ شادی کا فیصلہ کرنے میں اشفاق احمد کو سات سال لگے۔

بانو قدسیہ کے بقول:

''خاں صاحب نے روم سے واپسی پر شادی کا ارادہ کر لیا، تو اس گم سُم شہزادے کا کوئی مدد گار مزنگ روڈ میں نہ تھا۔ ان دنوں ڈیڈی جی نچلی منزل میں مقیم تھے۔ نہ جانے کیسے انہوں نے بھائی کی شکل کو بھانپ لیا یا پھر مفتی جی نے انہیں رازداں بنایا۔ وہی میری والدہ تک پہنچے۔ وہی نکاح خواں لائے۔ ان ہی کے دستخط نکاح نامے پر ہوئے۔'' (۲۱)

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی شادی ۱۹۵۵ء این سمن آباد میں نہایت سادگی سے ہوئی۔ بانو قدسیہ نے اپنا پرانا شلوار قمیض ہی پہنا اور اشفاق احمد نے معمولی لکیروں والا کُرتا زیب تن کیا۔ براتیوں میں مفتی جی، محمد حسین آرٹسٹ اور ڈیڈی جی تھے۔ شادی کی کوئی رسم نہ ہوئی، نہ مہندی ہوئی، نہ ہی ڈھولک بجائی گئی۔ نہایت سادگی سے نکاح کی رسم ہوئی اُس کے بعد اشفاق احمد نے مصنفہ کو اپنی چیک بک دے دی۔ اُس میں نو سو روپے جمع تھے۔ شادی کی خبر

جب پھیلی تو بابا جی تک بھی پہنچ گئی۔ انہوں نے اشفاق احمد کو تو کچھ نہ کہا البتہ افتخار بھائی اور آپی جی کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ وہ لوگ بچوں سمیت مصنفہ کی خالہ کے گھر آ گئے۔ آپی جی بہت زیادہ باہمت خاتون تھیں۔ اُن کے تینوں بیٹے طارق، حارث اور عدنان کریسنٹ ماڈل سکول میں تھے۔ انہوں نے مصنفہ کے ساتھ بہت محبت کا ثبوت دیا۔

بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

''اپنے بیٹے طارق کو میری گود بٹھا کر گود بھرائی کی رسم ادا کی اور اس طرح طارق بن افتخار میرا مستبنیٰ بن گیا۔ یہ نبھانے والے لوگ ہیں۔ طارق نے اس رسم کی لاج رکھی اور آج تک اُس نے اپنے چچا اور میری عزت او محبت کا مظاہرہ کیا جو اس رقم کی یاد دلاتا رہتا ہے۔'' (۲۲)

مصنفہ کہتی ہیں کہ آپی بہت ہمت والی خاتون تھیں گھر سے نکالے جانے کے باوجود اُن کی ہمت کم نہ ہوئی۔ وہ بچوں کو خود پڑھاتی تھیں۔ محبت اپنی جگہ وہ بچوں کو مکے اور ٹھڈے بھی مارتی تھیں۔ بانو کہتی ہیں کہ انہوں نے بچوں کو علم میں خود کفیل کر دیا تھا۔ مصنفہ اور اشفاق احمد روزانہ شام میں اُن کے گھر جاتے تھے وہی کھانا کھاتے تھے ۔اُن کی بڑی بیٹی بانو سے بہت مانوس تھی اور کبھی کبھار وہ اُن کے ساتھ سو جایا کرتی تھی۔

بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

''قدسیہ! یہ چوڑیاں اُتار دو۔ تم عموماً ایسی شوخ چوڑیاں نہیں پہنتیں۔ کہیں اماں جی کو شک نہ ہو جائے۔ میں نے کوئی حجت نہ کی چپ چاپ چوڑیاں اتار کر زینب کو دے دیں۔ امی نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ سامان باندھ کر ملتان جانے کی تیاری کر لی۔ جاتے وقت انہوں نے مجھ سے کہا۔

قدسیہ !اب خوش ہو؟

جی بہت خوش

یادرکھو اپنی مرضی کا فیصلہ عموماً مہنگا پڑتا ہے۔ اس کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ قیمت ادا کرتے وقت حوصلہ ،ہارنا،نہ کسی شخص سے شکایت کرنا۔" (۲۳)

مصنفہ کی امی جان کے ملتان چلے جانے کے بعد اشفاق احمد صاحب ہر روز رات میں تشریف لاتے۔ وہ رات وہی پر گزارتے اور صبح ہی صبح چلے جاتے تھے۔ مصنفہ نے اُن سے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ وہ کب شادی کی بات سب کو بتائیں گے، کب اعلان کریں گے کہ انہوں نے بانو قدسیہ سے شادی کرلی ہے۔ مصنفہ نے اُن سے کبھی اس بات کے بارے میں نہیں پوچھا کہ وہ کب تک اس بات کو راز میں رکھیں گے۔ بس وہ بہت خوش تھیں۔

بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

"خاں صاحب کے گھر میں رواج تھا کہ عام طور پر چھوٹے ہی بڑوں کے گھروں پر سلام کرنے جاتے اور بزرگ شاذ ہی چھوٹوں کے گھر گلچھڑے اڑاتے۔" (۲۴)

شادی کے بعد اپنی کامیابی، خوشحالی، عزت، شہرت اور دولت کو بانو قدسیہ اپنی شادی کا بابرکت نتیجہ سمجھتی تھیں۔ اشفاق احمد گھریلو زندگی میں دقیانوسی اور فرسودہ خیالات کے مالک تھے۔ وہ بانو قدسیہ کو لباس، جوتے، میک اپ بھی اپنی مرضی سے نہیں کرنے دیتے تھے۔ انہوں نے بانو کو لیکچرر کی نوکری بھی نہیں کرنے دی۔

بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

"ہمیں پیسے کی تنگی نہیں ہے جس کی وجہ سے تمہیں نوکری کرنی پڑے۔ گاڑی گھر پر موجود ہے۔ پھر پرسنل گاڑی اور ڈرائیور تو اسے درکار ہوتا ہے جو شخص بڑا سوشل ہو اور جسے گھر پر

وحشت ہوتی ہو۔۔۔رہ گیا خانساماں تو ہماری جیونی، رمضان سلامت رہیں۔ گھر پہلے ہی خدمت گزاروں سے بھرا پڑا ہے اور دو آدمی تابعدار بنا کر کیا ملے گا۔" (۲۵)

مصنفہ اس کتاب میں اشفاق احمد کے نظریات بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ اشفاق احمد کے خیال میں عورت اپنی خوبصورتی، خاوند اور بچوں کے سہارے پر اپنی زندگی گزارتی ہے۔ انہوں نے عورت کو ناقص العقل کہا ہے۔

بانو قدسیہ کے بقول:

"ہر عورت کی طرح تم بھی عورت کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہو۔ عورت کی بدنصیبی کہہ لو وہ اپنی ذات کے سہارے زندہ رہنا چاہتی ہے۔ کم بخت اتنی ناقص العقل ہے کہ نہیں جانتی بڑھاپا اس کے اندر پل رہا ہے۔" (۲۶)

اشفاق احمد صاحب نے بانو قدسیہ کو ساڑھی بھی نہیں پہننے دی۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے نزدیک ساڑھی غیر اسلامی اور ھندوانہ لباس ہے۔

بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

"بات یہ ہے قدسیہ کہ۔۔۔ کہ۔۔۔ دیکھو تم اپنا لباس تبدیل کر سکتی ہو؟
لباس۔۔۔ کیوں اس میں کیا خرابی ہے۔ ہم شادی پر جا رہے ہیں۔ ایسی قیمتی ساڑھیاں ایسے موقعوں پر ہی پہنی جاتی ہیں۔
آپ حکم دیں آپ چاہتے کیا ہیں؟
حکم نہیں قدسیہ۔۔۔ تم فیصلہ کرو۔۔۔ ہمارے گھر میں ساڑھی کا رواج نہیں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو میں ایسے ہی معتوب ہوں اور۔۔۔" (۲۷)

بانو قدسیہ نے اکثر مقامات پر غیر اہم واقعات کو بیان کر کے بے جا طوالت سے کام لیا ہے۔ اکثر مقامات پر قاری اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے اور اُسے صفحات پلٹ کر آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ بانو قدسیہ کے اس عمل سے ان کا تخلیقی اور ادبی مقام متاثر ہوتا نظر آتا ہے۔ مقبول عام ادب کا قاری اس قسم کی تفصیلات اور واقعات پڑھنے کا عادی ہوتا ہے لیکن ادب عالیہ میں اس طرح کی غیر ضروری تفصیلات اُس تصنیف کا نقص قرار پاتی ہیں۔

دبیر عباس اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''بانو آپا بڑی چتر کار ہیں اور رنگوں کی نفسیات اور اثرات سے بخوبی آشنا ہیں اور ان کی پکچر گیلری میں بڑی بڑی خوبصورت تصویریں او سکیچ نظر آتے ہیں۔ لیکن "راہِ رواں" میں آکر وہ تھکی تھکی محسوس ہوتی ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے بھی اپنے ایک کالم میں لکھا کہ بانو آپا"راہِ رواں "میں قدم قدم پر بھٹک جانے کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور اسی بھلکڑ پن نے یاد داشت کے تسلسل میں رخنے ڈالے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ تخلیقی روٹوٹتی جڑتی دکھائی دیتی ہے۔

"راہ رواں" کی ابواب بندی بھی تسائل کا شکار دکھائی دیتی ہے اوراس کے ساتھ بانو نے اپنی تخلیقی شناخت اور نفی ذات کا سودا کر کے اس تصنیف کے حُسن کو گہنا دیا ہے۔ انہوں نے اس تصنیف میں جابجا اشفاق احمد کی تعریف کی ہے۔ ''[۲۸]

۵۔ اشفاق احمد کا بچوں کے ساتھ تعلق:۔

بانو قدسیہ کے گھر ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۷ء میں انیق پیدا ہوئے اور ایک سال کے بعد ۱۶ ستمبر ۱۹۵۸ء میں اُن کے بیٹے انیس پیدا ہوئے۔ مصنفہ کی والدہ محترمہ اُن کے لیے فکر مند تھیں کہ وہ کیسے ایک جیسے دو بچوں کی پرورش ایک

ساتھ کریں گی۔ وہ جانتی تھیں کہ مصنفہ سادہ لوں انسان ہیں اور اُن کو بچوں کی پرورش کرنے کا کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔ لیکن جو بھی ہوتا ہے اچھے کے لیے ہی ہوتا ہے مصنفہ کے دونوں بچے ایک ساتھ نہایت آرام سے بڑے ہونے لگے۔ اشفاق احمد بھی اُن کی مدد کرتے تھے۔

بانو قدسیہ کے بقول:

> ''خاں صاحب نے میری بہت مدد کی چھوٹا سا انیق جب گر دم اٹھتا اور دودھ کے لیے ضد کرتا تو خاں صاحب اسے گود میں اٹھا کر باہر لے جاتے اور سڑک پر ٹہلاتے۔ اتنی دیر میں دودھ کی بوتل تیار ہو جاتی اور یوں بچے کو زیادہ رونے سے بچا لیا جاتا۔'' [۲۹]

بانو قدسیہ کو انیق کی پرورش کرتے ہوئے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ بچوں کو کیسے پالا جاتا ہے۔ انیس کی باری مصنفہ کو کوئی مشکل نہیں ہوئی اس کے علاوہ اُن کا بیٹا انیس، انیق کی طرح زیادہ روتا نہیں تھا اس سے مصنفہ کو زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جب اثیر احمد نے ۱۵ جون ۱۹۶۲ء میں بانو قدسیہ کے گھر آنکھ کھولی تو تب مصنفہ کے گھر کے حالات کافی بہتر تھے۔ اثیر احمد بانو قدسیہ کے تیسرے فرزند ہیں۔ بچپن میں انہیں دودھ سے الرجی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر فاروقی کے کہنے پر اثیر کو بکری کا دودھ پلانا شروع کیا گیا۔ بانو قدسیہ گھر میں بکری کے آنے اور اس سے اشفاق احمد کی وابستگی بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

> ''سمن آباد کے اندرونی غسل خانے میں کالے پیروں والی سفید گابھن بکری کو باندھا جاتا۔ خاں صاحب آجاتے تو بکری کو آنگن میں اُگے ہوئے دھریک کے نیچے لے آتے۔ محمد علی بکری کے لیے چارہ پٹھے لاتا۔ خاں صاحب خود اسے بڑے پریم سے دانہ پٹھے کھلاتے۔ میں ایک فاصلے سے ان کا شغل دیکھتی اور سوچتی کہ کیا انہیں بکری سے بو نہیں آتی۔'' [۳۰]

مصنفہ کہتی ہیں کہ اشفاق احمد بکری کے چلے جانے کے بعد بہت دن تک اداس رہے۔ جہاں بکری باندھی جاتی تھی اکثر وہاں جا کر خاموش کھڑے ہوتے تھے جیسے کہ کچھ یاد کر رہے ہوں۔ بکری کے چلے جانے کے بعد وہ ایک دن گھر میں ایک پنجرہ لے آئے جس میں سرخے تھے جو بچوں کو بہت پسند آئے۔ پنجرے کے اندر چھوٹی کٹوریاں بنی ہوئی تھیں اُن میں پانی اور باجرہ ڈالتے تھے۔ انیس کو بھی جانوروں کا بہت شوق تھا جبکہ انیق اور اثیر کو کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ وہ دیر تک پرندوں میں خوش رہتا اور یوں سرخے بھی اُس نے اپنے بنا لیے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے پرندوں کو دانے ڈالتا تھا جبکہ انیق منع کرتا تھا اثیر احمد نے بھائیوں سے دوڑنا، بھاگنا سیکھ لیا تھا۔ اثیر احمد مشینوں اور ٹیپ ریکاڈر کا شوقین تھا اور یوں تینوں بچے بڑے ہو گئے۔ مندرجہ بالا تمام واقعات غیر اہم ہیں۔ ان سب کو مصنفہ نے سوانح میں شامل کر کے سوانح کی صنف کو مزید طول بخشا ہے۔

اشفاق احمد بچوں کی تعلیم کے حوالے سے زیادہ سنجیدہ نہیں تھے۔ وہ صرف اپنے کام سے مخلص تھے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت میں کبھی انہوں نے دلچسپی نہیں لی ہے۔ یہاں تک کہ اُن کی خوشی کے موقع پر بھی کبھی اُن کا ساتھ نہ دیا۔ نہ کبھی بچوں کی کامیابی پر بچوں کو مبارکباد تک دی۔

بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

"میرے بچوں نے واقعتاً تعلیم کی طرف توجہ نہ دی مجھے اس کی تین وجوہات نظر آتی ہیں۔ خاں صاحب مکمل طور پر ٹرسٹ کرتے تھے۔ اس اعتماد کی غالباً وجہ ان کی اردو بورڈ میں مصروفیات اور پھر ریڈیو پاکستان اور ٹیلی ویژن لاہور میں حاضری اور کام بھی ایسا نہ تھا کہ انہیں بچوں کی طرف سے غفلت برتنا پڑی۔" (۳۱)

بانو قدسیہ کے بقول:

"خاں صاحب گفتگو میں بھی عام طور پر یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ ان پڑھ انسان نے پاکستان کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا کہ پڑھے لکھوں نے پہنچایا ہے۔" (۳۲)

اشفاق احمد نے بچپن میں تو بچوں پر شفقت کی مگر جب وہ جوان ہوئے اور اپنی زندگیوں میں کسی مقام پر پہنچے تو انہیں والد محترم کی طرف سے اُتنا پیار اور توجہ نہ ملی جس کے وہ حق دار تھے۔

بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

"(انیق) گولڈ میڈل ہاتھ میں لیے ہاروں سے لدا پھندا وہ ہمارے بیڈ روم میں آیا۔ خاں صاحب حسبِ عادت اپنی مخصوص ٹیبل کے آگے کرسی کھینچے کتابوں کی ورق گردانی میں مشغول تھے۔

ایکسکیوزمی ابو۔۔۔ انیق بولے۔ ابو نے نظریں کتاب سے اُٹھائے بغیر "ہوں" کہا۔

ابو مجھے گولڈ میڈل ملا ہے۔ میں ایم ایس سی میں فرسٹ آیا ہوں۔

اب بھی انہوں نے انیق پر نظر نہ کی اور اپنے خیالوں میں مشغول لاتعلقی سے بولے

اچھی بات ہے مبارک ہو۔" (۳۳)

اثیر خان کرکٹ کا کھلاڑی تھا۔ این ڈی ایف سی میں بہت سے بینکوں کے درمیان مقابلے ہوئے اثیر احمد ٹیم کا کپتان تھا۔ اثیر احمد جس ٹیم کے ساتھ تھا اس ٹیم کو کامیابی حاصل ہوئی اور مین آف دی میچ کی ٹرافی اثیر کو ملی وہ ٹرافی لے کر گھر آیا تو اشفاق احمد "تلقین شاہ" لکھ رہے تھے۔ اثیر نے ابو جان کو متوجہ کرنے کے لیے ٹرافی دکھائی لیکن خان صاحب لکھتے رہے انہوں نے نظریں اٹھائے بغیر بولا کے ٹرافی کو کتابوں کی الماری کے اوپر رکھ دو اثیر کو بہت دکھ ہوا اُس نے ٹرافی کو کپڑوں کے نیچے چھپا کر رکھ دیا۔

بانو قدسیہ کے بقول:

''میرے بچوں نے بظاہر دنیا جیت لی لیکن وہ اپنے اندر گپ شپ اور اداس رستے چلے گئے۔ میں بھی ایک ایسی ہی ماں تھی جس کی تربیت اور تعلیم دونوں ٹھگ بازی تھیں۔ میں صرفPamper کرنے کی خوبی سمجھتی تھی۔ میں اُن کو ہوم ورک کرانے کے بجائے ان کا ہوم ورک کرنے کی عادی تھی۔ یہ تینوں اپنے آبائی لوگوں کی طرح بے حد شریف اور غیرت مند تھے۔ انہوں نے نہ کبھی ہم سے گلہ کیا، نہ کبھی دستِ سوال ہی دراز کر کے اپنے آپ کو شرمندہ کیا۔ '' (۴۴)

اشفاق احمد اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ نہیں دیتے تھے۔ وہ صرف اپنے کیریر پر توجہ دیتے تھے۔ بچوں کے مقابلے میں اپنی ذات کو ترجیح دنیا خاندانی نظام کے لیے بہتر سمجھتے تھے۔ حالانکہ اعتدال پسندی زیادہ بہتر ہے۔ لیکن بانو قدسیہ اشفاق احمد کی حمایت کرتی ہیں۔ اشفاق احمد کے گھر میں کوئی بھی خوشی منانا جرم سمجھا جاتا تھا۔ سالگرہ منانا بھی جرم تھا۔ اشفاق احمد کے والد اور اُن کے بھائی اور خود اشفاق احمد بچوں کی اس تفریح کے سخت خلاف تھے۔

اشفاق احمد بحیثیت باپ کمزور شخصیت کے مالک انسان تھے خود بانو قدسیہ نے ان باتوں کا اعتراف کیا ہے لیکن "راہِ رواں" میں کہیں ایسا اظہار نہیں ملتا جہاں بانو قدسیہ نے یہ کہا ہو کہ اشفاق احمد نے غلط کیا یا انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ اپنے بچوں کے باپ سے زیادہ اپنے شوہر کی محبت میں گرفتار نظر آتی ہیں اور اشفاق احمد کی شخصیت کے کمزور پہلو بیان کر کے فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتی تھیں کہ وہ خود ان واقعات سے نتائج اخذ کرتے۔

۶۔ اشفاق احمد کی شخصیت کے مختلف پہلو:۔

بانو قدسیہ اشفاق احمد کی شخصیت کے بیان میں اُن کی زندگی کے اس پہلو تک ہی ہیں جو کہ اُن کی ظاہری شخصیت کا عکاس تھا۔ انہوں نے اشفاق احمد کی ذاتی پسند ناپسند پر زیادہ بات نہیں کی۔ بلکہ اُن کی شخصیت کا وہی پہلو بیان کیا ہے جو کہ اُن کی شخصیت کا ظاہری پہلو ہے۔ بانو قدسیہ اشفاق احمد کی شخصیت کا بیان کرتے ہوئے اُن کی خوبیوں اور اچھائیوں کا ذکر ہی کرتی ہیں اس کے علاوہ بانو قدسیہ، منیر نیازی اور اداکار قوی خان کی زندگی اور شخصیت پر مختصر تبصرہ کرتی ہیں۔ فیض احمد فیض کے حوالے سے بھی دو تین واقعات بیان کرتی ہیں۔

بانو لکھتی ہیں:

> ''دراصل اشفاق احمد نے بڑی کرب کی زندگی گزاری اور اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ وہ کسی کی دلا ازاری کو سب سے بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ اُن پر حقیقت نہ کھلی کہ دل شکنی زندگی کا ایک مصنف ہے۔ اللہ یہاں بھی کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر آفت بنا کر نازل کر دیتا ہے۔ کبھی رحمت بنا دیتا ہے۔ یہ سب اُس کے کھیل ہیں۔''(۳۵)

بانو قدسیہ نے تقریباً کتاب کے ہر باب میں اپنے بیٹوں کا ذکر لازمی شامل کیا ہے۔ خان صاحب اپنے پروفیشن کو اپنی فیملی اور خاندان پر ترجیح دیتے تھے۔ اپنے کیریئر کو گھریلو خوشی، غمی، مسائل سے زیادہ اہم سمجھتے۔ اپنے بیٹوں کی تعلیم، تربیت، خوشیوں، شوق، رجحانات اور مسائل پر کبھی توجہ نہ دیتی۔ اشفاق احمد کی اپنی فیملی اور خاندان سے محبت کا ذکر بانو قدسیہ کتاب کے ہر باب میں کرتی ہیں۔ بانو قدسیہ بیان کرتی ہیں کہ اشفاق احمد صاحب محبِ وطن تھے۔ وہ اتنی تحریروں کے ذریعے اسلام اور پاکستان کو اولیت دیتے۔ اپنی ذات، فیملی اور خاندان پر اسلام اور پاکستان کو ترجیح دیتے۔

بانو قدسیہ جگہ جگہ اشفاق احمد کی حب الوطنی، عاجزی، تضادات، خوش گفتاری، معاشی مشکلات، انسانیت کا ذکر کیا ہے۔ اُن کے تین مشہور پروگرام " ہم آ گئے "، تلقین شاہ اور "دادِ ولوتار" اُن کی حب الوطنی کا ثبوت ہیں۔ وہ تحفے وصول کرنا اور فرمائشیں کرنا پسند کرتے تھے۔ بانو لکھتی ہیں کہ یہ ان چیزوں میں ماہر تھے اور مصنفہ کے نزدیک یہ اشفاق احمد صاحب کی عاجزی اور انکساری تھی۔

بانو قدسیہ کچھ یوں رقم طراز ہیں:

"جب لوگ نعرے لگاتے "پاکستان کا مطلب کیا؟" تو خان صاحب اُن کے ساتھ مل کر جواب دیتے "لا الہ الا اللہ"۔" (۳۶)

بانو قدسیہ نے پٹھانوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے صرف ایک خصوصیت سے انصاف کیا ہے کہ پٹھان کسی غیر پٹھان کے ساتھ گُھل مل نہیں سکتا۔ مصنفہ نے اشفاق احمد کے نظریہ محبت کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ چونکہ وہ پٹھان تھے اور خان صاحب ماضی پسند، ناسٹیلجیا کا شکار تھے۔ اپنے شہر ہوشیار پور کو یاد کرتے، جالندھر کو یاد کرتے۔ بالکل اسی طرح ۱۹۴۷ء این سمن آباد سے محبت کرتے۔ اُن گلیوں، سڑکوں، پارکوں، سکولوں، باغوں، دودھ والے، سبزی فروش، حجام کو یاد کرتے اور ماڈل ٹاؤن جانے کے بعد اپنے سمن آباد والے گھر کی طرف مسلسل چکر لگاتے۔ جن شہروں، علاقوں، گھروں، ملازموں اور دوستوں سے مانوس ہو جاتے۔ ساری زندگی اُن کا ساتھ نہ چھوڑتے۔ مکان کی تبدیلی اُن کو اداس کر جاتی۔

مختصراً یہ کہ بانو قدسیہ کے اشفاق احمد کی شخصیت کو ایسا بنا کر پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے اُن سے محبت اور عقیدت کا اظہار کریں چونکہ وہ خود اُن سے محبت کرتی تھیں۔ اس لیے محبت میں صرف مثبت پہلوؤں کو دیکھ سکیں۔

بانو قدسیہ نے میں اشفاق احمد کے اٹھارہ اردو اور پانچ انگریزی خطوط شامل کیے ہیں۔ اشفاق احمد نے روم سے بانو قدسیہ اُن کی والدہ اور بھائی کو لکھے۔ اشفاق احمد کے یہ خطوط نجی نوعیت کے ہیں جس سے اُن کی شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ ان خطوط میں نجی حوالوں کے علاوہ درج ذیل موضوعات پر اظہار بھی ملتا ہے۔

مذہب پسندی، الحاد، جذبات نگاری، احساس محرومی، اذیت پسندی، نا امیدی، سفر نامہ نگاری، اخلاقیات، معاشرت، معیشت، اظہار محبت، جذباتی استحصال، خود ستائی، مزاح نگاری، شوخی شراتِ اور طنز، احسان مندی، شراب نوشی اور سگریٹ نوشی، فطرت نگاری، ثقافت، اشعار کا استعمال، نفسیات نگاری اور منظر نگاری۔ اشفاق احمد نے ان خطوط کے ذریعے بانو قدسیہ کی فیملی کو متاثر کرنے کی کوشش کی۔ بانو کی والدہ اور بھائی سے اظہارِ محبت کیا۔ جذباتی انداز میں بانو کی والدہ کو مطمئن کیا کہ میں آپکی پوری فیملی کا ہمدرد، مخلص اور خیر خواہ ہوں۔ برے دل میں آپ سب کیلئے محبت اور دردمندی کے جذبات ہیں۔ میں آپ سب کا بھلا چاہتا ہوں۔ نیک نیت ہوں۔

اشفاق احمد کے بقول:

"آپکی دعائیں مجھے بڑا آدمی بنا دیں گی، بہت بڑا آدمی۔"(۳۷)

اور اشفاق احمد اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے اور پوری فیملی کے قریب ہو گئے اُنکے گھر کا فرد بن گئے۔ اُنکے گھر کے تمام فیصلوں میں شریک ہو گئے۔ اپنی جادوئی تحریر کی بدولت اُنکے دلوں میں گھر کر گئے۔ وہ تعلقات بنانے کے فن اور کسی کو قائل کرنے کے فن میں ماہر تھے۔ روم کی ثقافت، معیشت، معاشرت، اخلاقیات کا ذکر بھی ان خطوط میں ملتا ہے۔ اُنکا تجربہ، مشاہدہ، جزئیات نگاری اور حافظہ شاندار رہے۔ وہ اپنے خطوں کے ذریعے روم کی سیر کراتے ہیں۔ ان خطوط میں مذہب پسندی اور الحاد جیسی متضاد اصطلاحات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اشفاق احمد خود امید پرست تھے لیکن ان تحریروں میں نا امیدی، مایوسی، احساس محرومی، احساسِ جرم اور اذیت پسندی سے

بھرے جملے بھی مل جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ طنز مزاح شوخی اور شرارت بھی موجود ہے۔ اُنہوں نے اپنی شراب نوشی اور سگریٹ نوشی کا بھی ذکر ان خطوط میں کیا ہے۔

پٹھان چونکہ شرمیلے ہوتے ہیں اس لیے اُن کے مطابق اشفاق احمد شرمیلے اور غیرت مند پٹھان تھے اور محبت کے اظہار کے معاملے میں گونگے تھے۔ وہ کہتی ہیں کہ میرے ساتھ تعلق بڑھانے کے خواہش مند بھی تھے اور خوف زدہ بھی تھے۔ یہ اُن کی شخصیت کا ایک تضاد تھا۔

بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

"خان صاحب اظہار کو احساس شکست سمجھتے تھے۔ جب انہیں کلی یقین تھا کہ محبت کا ہلکا سا اعتراف بھی اُن کی مکمل شکست پر منتج ہو گا۔ ابھی تو وہ اپنے خاندان کی روایات میں جکڑ بند تھے۔ پھر قدسیہ بیگم کی ہتھکڑی بھی لگ جائے گی۔ لیکن اندر کا تضاد انہیں کسی طور پر جینے نہ دیتا تھا ایسے میں وہ عجیب طرح سے خوف زدہ ہو کر رہ گئے۔ "(۳۸)

بانو قدسیہ کو اشفاق احمد کتابیں پڑھنے کے لیے دیتے تھے۔ کتابوں کا تبادلہ کرتے۔ ادھار مانگ کر واپس نہیں کرتے تھے۔ اپنے آپ کو بوڑھا ظاہر کرتے تھے تاکہ لڑکیاں متوجہ نہ ہوں۔ مصنفہ بھی محبت کے اظہار کی قائل نہ تھیں۔ دونوں طرف یہ امید بندھی تھی کہ دوسرا فریق بحث کا اظہار کرے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

آپ بیتی یا سوانح کی سب سے بڑی خوبی شخصیت نگاری ہے۔ شخصیت نگاری سے مراد کسی بھی شخص کی مکمل لفظی تصویر ہے۔ اُسکی عادات، شکل صورت، قد کاٹھ، وضع قطع، خدوخال، آواز، گفتگو، چال ڈھال، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، خیالات، جذبات، رجحانات، عادات، شوق، نفسیات، فطرت، نشت و برخاست، خوبیاں، خامیاں، صلاحیتیں، ہنر، مہارتیں، آداب، تہذیب، لباس، شخصیت نگاری میں شامل ہیں۔ شخصیت نگاری میں کسی بھی شخص کے مثبت

اور منفی دونوں پہلو، اچھائی، برائی، نیکی، بدی شامل ہیں۔ "راہِ رواں" کا مطالعہ کیا جائے تو کسی بھی کردار کی مکمل شخصیت ابھر کر سامنے نہیں آتی۔ حتیٰ کہ اشفاق احمد جن کی شخصیت پر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اُن کی شخصیت کی بھی ادھوری اور نامکمل تصویر سامنے آتی ہے۔ بانو قدسیہ کرداروں کے روشن پہلوؤں کو صرف اُجاگر کرتی نظر آتی ہیں ۔ کرداروں کے منفی پہلو بیان نہیں کرتیں۔ ادبی، فنی، فکری لحاظ سے یہ کتاب ادھوری سوانح ہے۔ نامکمل آپ بیتی ہے۔ سچائی اور صداقت کے پہلو چھپائے گئے ہیں ۔ سوانح عمری اور آپ بیتی کی بنیادی خوبی حقیقت پسندی اور صداقت پسندی ہے۔ لیکن بانو قدسیہ مثالیت پسند اور رومانیت پسند واقع ہوئی ہیں۔ سوانح نگار کو مورخ کی طرح سچائی سامنے لانی چاہیے جبکہ بانو قدسیہ کا مزاج، محقق اور مورخ سے بہت مختلف ہے ۔ وہ صرف شخصیتوں کے روشن، مثبت پہلو اور خوبیاں تحریر تی نظر آتی ہیں۔

بانو قدسیہ کے بقول:۔

"میں ایک بار پھر عرض کرنا چاہوں گی کہ میری کتاب سچ کی دعویٰ دار نہیں۔" (۳۹)

بانو قدسیہ ایک طرف یہ لکھتی ہیں کہ اشفاق احمد اظہار کرنا پسند نہیں کرتے تھے جبکہ اُن کے خطوط میں بھرپور اظہار ملتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ یا تو بانو انہیں اچھی طرح جانتی نہیں تھیں یا اشفاق احمد تحریراً تو اظہار کرتے تھے مگر زبانی نہیں۔ بانو قدسیہ اشفاق احمد کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی بیان کرتی ہیں جو کہ تصوف کا ہے۔ اشفاق احمد کی شخصیت کا یہ پہلو اس کتاب میں بہت توانا نظر آتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے ایسا گمان ہوتا ہے کہ بانو شعوری طور پر اشفاق احمد کو صوفی، قناعت پسند اور درویش کے روپ میں پیش کرنا چاہتی ہیں۔

ایک جگہ وہ لکھتی ہیں:

”اشفاق صاحب نے دنیا کمائی تو بیوی بچوں کے لیے لیکن یقین جانئے وہ دنیا سے وابستہ نہیں ہوتے۔“(۴۰)

جبکہ حقیقت اس کے بر عکس ہے اشفاق احمد اسٹیبلشمنٹ کے قریب رہے اور اُن کی مہربانیوں سے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور ایک آئیڈیل زندگی بسر کی۔ اشفاق احمد صوفیوں اور بابوں سے بہت متاثر نظر آتے ہیں اور اُن کے بیٹے کے باہر جانے کی پیشن گوئی کی تھی جو سچ ثابت ہوئی اس لیے ان کا اعتقاد مضبوط ہو تا گیا۔ تصوف، روحانیت، قناعت پسندی ان کے محبوب موضوعات ہیں یہی وجہ ہے کہ ”راہِ رواں“ میں صوفی طبقہ غالب نظر آتا ہے۔ بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کی تحریریں بھی اسی طرح کے موضوعات کے گرد گھومتی ہیں وہ اپنے قاری تصوف کی دنیا میں گم کر دیتے ہیں اُسے قناعت پسندی اور تقدیر پرستی کا سبق دیتے ہیں اور یہ سلسلہ۔ ”راہِ رواں“ میں بھی نظر آتا ہے۔ صوفیوں اور بابوں پر اعتقاد کی مثالیں ملاحظہ کریں۔

”حفیظ اللہ صاحب کی معیت ایک پٹواری صاحب بھی ہمارے گھر آیا کرتے جو سورۃ المزمل کے عامل تھے اور سنا ہے کچھ جنات ان کے قبضے میں تھے۔ وہ با آواز بلند سورۃ المزمل پڑھتے۔ پھر اللہ ہو اکبر کا نعرہ لگاتے۔ ایک بند مُٹھی فرش پر مارنے کے انداز میں آگے گرتے اور عالم غیب سے موسمی پھل سفید بچھی ہوئی چادروں کے گرنے لگتے۔ ہم لوگ چشم حیرت سے انہیں دیکھتے اور فرمائشیں کرتے۔“(۴۱)

ایک اور جگہ یوں لکھتی ہیں:

”قدسیہ ڈیرہ پاک چلو گی۔

ہاں جی ضرور

تم کبھی پہلے کسی ڈیرے پر گئی ہو؟

میں نہیں خان جی۔۔۔۔۔مجھے معلوم نہیں ڈیرہ کیا ہوتا ہے؟

بڑی آئیڈیل جگہ ہے۔ بڑا آنند ملتا ہے۔ آدمی ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے" (۴۲)

اشفاق احمد خود ادیب تھے بانو قدسیہ نے انہیں بطور ادیب تو جیسے نظر انداز ہی کر دیا ہے وہ اشفاق احمد کی قناعت پسندی اور تقدیر پرستی میں ایسی مگن نظر آئیں۔ اشفاق صاحب کی شخصیت کے چند پہلوؤں پر ہی قناعت کر سکیں۔

۷۔ اشفاق احمد کے خطوط کا تجزیہ:۔

اس کتاب کے پانچویں باب کا عنوان "ملتان (نان کے پاس)" ہے۔ یہ باب اٹھائیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس حصے میں اشفاق احمد کے اٹھارہ اردو اور پانچ انگریزی خطوط شامل ہیں۔ اشفاق احمد نے روم سے بانو قدسیہ اُسکی والدہ اور بھائی کو لکھے۔ ان خطوط کو توجہ سے پڑھنے کے بعد درج ذیل فکری خصوصیات نظر آئیں اور موضوعات کچھ اس طرح سے تھے۔

مذہب پسندی، الحاد، جذبات نگاری، احساس محرومی، اذیت پسندی، ناامیدی، سفر نامہ نگاری، اخلاقیات، معاشرت، معیشت، اظہار محبت، جذباتی استحصال، خودستائی، مزاح نگاری، شوخی شراتِ اور طنز، احسان مندی، شراب نوشی اور سگریٹ نوشی، فطرت نگاری، ثقافت، اشعار کا استعمال، نفسیات نگاری اور منظر نگاری۔ اشفاق احمد نے ان خطوط کے ذریعے بانو قدسیہ کی فیملی کو متاثر کرنے کی کوشش کی۔ بانو کی والدہ اور بھائی سے اظہارِ محبت کیا۔ جذباتی انداز میں بانو کی والدہ کو مطمئن کیا کہ میں آپکی پوری فیملی کا ہمدرد، مخلص اور خیر خواہ ہوں۔

برے دل میں آپ سب کیلئے محبت اور دردمندی کے جذبات ہیں۔ میں آپ سب کا بھلا چاہتا ہوں۔ نیک نیت ہوں۔

اشفاق احمد کے بقول:

"آپکی دعائیں مجھے بڑا آدمی بنا دیں گی ۔ بہت بڑا آدمی۔"(۴۳)

اور اشفاق احمد اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے اور پوری فیملی کے قریب ہوگئے اُنکے گھر کا فرد بن گئے۔ اُنکے گھر کے تمام فیصلوں میں شریک ہوگئے۔ اپنی چرب زبانی اور جادوئی تحریر کو بدولت اُنکے دلوں میں گھر کر گئے۔ اشفاق احمد تعلقات بنانے کے فن اور کسی کو قائل کرنے کے فن میں ماہر تھے۔ روم کی ثقافت، معیشت، معاشرت، اخلاقیات کا ذکر بھی ان خطوط میں ملتا ہے۔ اُنکا تجربہ، مشاہدہ، جزیات نگاری اور حافظہ شاندار ہے۔ وہ اپنے خطوں کے ذریعے روم کی سیر کراتے ہیں۔ ان خطوط میں مذہب پسندی اور الحاد جیسی متضاد اصلاحات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اشفاق احمد خود امید پرست تھے لیکن ان تحریروں میں ناامیدی، مایوسی، احساس محرومی، احساسِ جرم اور اذیت پسندی سے بھرے جملے بھی مل جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ طنز مزاح شوخی اور شرارت بھی موجود ہے۔ اُنہوں نے اپنی شراب نوشی اور سگریٹ نوشی کا بھی ذکر ان خطوط میں کیا ہے۔

اشفاق احمد کے بقول:

"میں اکیلا بے یارومددگار زندگی کے دنوں کو دھکے مار مار کے آگے لڑھکارتا ہوں۔"(۴۴)

بانو قدسیہ نے بیانیہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس باب میں تصوف، فلسفہ اور ماضی پرستی کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔ خدا کی تلاش، کائنات کو سمجھنے کا درس دیا گیا ہے۔ اعتدال پسندی سے زندگی گزارنے کا کہا گیا ہے۔ سرسری

انداز میں شفقت جو کہ بانو کی سہیلی تھی اُس کا خاکہ بیان کیا گیا ہے۔ آذر زولی، خان صاحب دوست تھے اُنکے بارے میں بھی چند الفاظ تحریر کیئے گئے ہیں۔

اشفاق احمد کا بانو قدسیہ کی والدہ کو خط:

"واقعی امی مجھے کا کی اور کا کا سے بڑا پیار ہے۔"(۴۵)

بانو قدسیہ کی والدہ کا ذکر بھی ہے جو ایک قدامت پسند اور رجعت پسند خاتون تھیں خود پڑھی لکھی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں لیکن خیالات قدیم تھے۔ وہ عورت کی مخلوط تعلیم، نوکری کے سخت خلاف تھیں۔ لیکن خود محکمہ تعلیم میں آفیسر تھیں اور اپنی بیٹی کو بھی گورنمنٹ کالج میں مخلوط تعلیم دلوائی۔ اُنکی شخصیت کے یہ تضادات اس کتاب میں جابجا نظر آتے ہیں۔

۸۔ دیگر شخصیات:۔

"راہِ رواں" اشفاق احمد کی سوانح ہے یا نہیں اس بیان سے قطع نظر اگر "راہِ رواں" کا تجزیہ کریں تو اس میں کرداروں کی بھرمار نظر آتی ہیں۔ بانو قدسیہ نے اس سوانح میں اتنے کردار بیان کیے ہیں کہ بعض اوقات یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس کا کس سے کیا تعلق ہے۔ کرداروں کی بھرمار ہے۔ "راہِ رواں" میں داستانوی رنگ چھلکنے لگتا ہے۔ بے جا طوالت کی وجہ سے بہت سے غیر اہم کردار بھی اس میں نظر آتے ہیں اور قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوئی داستان پڑھ رہا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ بانو قدسیہ، ''راہِ رواں''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱، ص ۷

۲۔ ایضاً، ص ۷

۳۔ ایضاً، ص ۷

۴۔ ایضاً، ص ۷

۵۔ ایضاً، ص ۱۲

۶۔ ایضاً، ص ۱۳

۷۔ ایضاً، ص ۱۴

۸۔ راقمہ کا ڈاکٹر اقلیمہ ناز سے انٹرویو بذریعہ ٹیلی فون، ۱۵ اگست ۲۰۱۸

۹۔ راقمہ کا ڈاکٹر اقلیمہ ناز سے انٹرویو بذریعہ ٹیلی فون، ۱۵ اگست ۲۰۱۸

۱۰۔ راقمہ کا ڈاکٹر اقلیمہ ناز سے انٹرویو، ایضاً

۱۱۔ راقمہ کا ڈاکٹر اقلیمہ ناز سے انٹرویو، ایضاً

۱۲۔ بانو قدسیہ، ''راہِ رواں''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱، ص ۱۴

۱۳۔ ممتاز مفتی، ''اور اوکھے لوگ''، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۵۱، ص ۱۱۳

۱۴۔ بانو قدسیہ، ''راہِ رواں''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱، ص ۱۳

۱۵۔ ایضاً، ص ۹۷

۱۶۔ ایضاً، ص۲۷۔۲۶

۱۷۔ ایضاً، ص۲۸

۱۸۔ ایضاً، ص۲۸

۱۹۔ ایضاً، ص۲۹

۲۰۔ ایضاً، ص۱۰

۲۱۔ ایضاً، ص۲۴

۲۲۔ ایضاً، ص۲۵

۲۳۔ ایضاً، ص۱۷۱

۲۴۔ ایضاً، ص۱۷۶

۲۵۔ ایضاً، ص۲۳۰۔۲۲۹

۲۶۔ ایضاً، ص۲۲۶

۲۷۔ ایضاً، ص۲۲۷

۲۸۔ دبیر عباس، "بانو اور اشفاق احمد کا زندگی نامہ" www.jahan-e-urdu.com

۲۹۔ بانو قدسیہ، ''راہِ رواں''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱، ص۲۲۷

۳۰۔ ایضاً، ص۱۹۵۔۱۹۴

۳۱۔ ایضاً، ص۲۹۵

۳۲۔ ایضاً، ص۲۹۶

۳۳۔ ایضاً، ص۲۹۶

۳۴۔ ایضاً، ص۲۹۹

۳۵۔ ایضاً، ص۳۳

۳۶۔ ایضاً، ص۷۵

۳۷۔ ایضاً، ص۳۱

۳۸۔ ایضاً، ص۳۷۶

۳۹۔ ایضاً، ص۳۷۶

۴۰۔ ایضاً، ص۱۴

۴۱۔ ایضاً، ص۱۸

۴۲۔ ایضاً، ص۳۷۶

۴۳۔ ایضاً، ص۱۲۳

۴۴۔ ایضاً، ص۱۲۵

۴۵۔ ایضاً، ص۱۳۱

باب سوم:

"راہ رواں" کا فنی مطالعہ

ا۔پلاٹ:۔

کسی بھی تحریر کی خوبصورتی کا انحصار واقعات کی ترتیب پر ہوتا ہے۔قصے اور کہانی کے مختلف حصوں میں جتنا زیادہ ربط ہو گا۔ تحریر بھی اتنی ہی موثر ہو گی۔اس لئے تحریر کا مرکز اُس کا پلاٹ ہوتا ہے۔پلاٹ، واقعات کی منطقی ترتیب کو کہتے ہیں۔پلاٹ کی بہت سی اقسام ہیں۔مثال کے طور پر منظم اور غیر منظم پلاٹ۔ منظم پلاٹ کی بہترین مثال اردو کا مشہور ناول "امراؤ جان ادا" ہے جبکہ غیر منظم پلاٹ کی مثال ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ہیں۔ منظم پلاٹ کسی بھی تحریر کی بہت بڑی فنی اور جمالیاتی خوبی سمجھی جاتی ہے۔پلاٹ سادہ بھی ہوتے ہیں اور پیچیدہ بھی۔ پیچیدہ پلاٹ کی مثال اردو ادب کی داستان ہے۔داستانوں میں پیچیدہ ترین پلاٹ ہوتے ہیں۔واقعات در واقعات کا لامتناہی سلسلہ ہوتا ہے۔جبکہ سادہ پلاٹ میں محدود واقعات ہوتے ہیں۔اگر راہِ رواں کے پلاٹ کا جائزہ لیا جائے تو بانو قدسیہ نے بنیاد سادہ پلاٹ پر رکھی ہے۔سیدھا سادہ، ڈھیلا ڈھالا پلاٹ ہے۔عام قارئین کیلئے پلاٹ میں دلچسپی اور حیرت کے عناصر موجود ہیں۔" راہِ رواں" کا پلاٹ عام قارئین کی ذہنی سطح کے عین مطابق ہے۔بانو قدسیہ نے پلاٹ کو اٹھارہ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔اٹھارہ عنوانات دے کر اٹھارہ چھوٹے پلاٹ بنا دیئے گئے ہیں۔" راہِ رواں" کو پڑھ کر محسوس ہوتا گویا اٹھارہ مختلف کہانیاں لکھی گئی ہوں۔مرکزی پلاٹ کی بجائے کتاب کو چھوٹے چھوٹے پلاٹ میں تقسیم کیا گیا ہے۔جسکی وجہ سے ایک ڈھیلا اور غیر منظم پلاٹ وجود میں آیا ہے۔مختلف عنوانات دینے کی بجائے منظم پلاٹ کے ذریعے تحریر کو آگے بڑھایا جاتا تو پلاٹ کا زیادہ خوبصورت، موثر، منظم ہوتا ۔ مجموعی طور پلاٹ اوسط درجے کا ہے۔نہ ہی اس پلاٹ کو بہت بُرا کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی بہت اچھا۔کتاب بھی اوسط درجے کی ہے اور پلاٹ بھی۔

’’ راہِ رواں‘‘ چونکہ سوانح ہے تو واقعات میں ربط اور ترتیب کا ہونا ضروری ہے لیکن یہاں اس کی کمی نظر آتی ہے۔ بانو قدسیہ کی یہ تصنیف پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہیں جیسے جیسے واقعات یاد آتے گئے وہ انہیں تحریر کرتی گئیں۔

’’ راہِ رواں‘‘ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت لکھی گئی ہوتی تو تحریر سے پہلے اس کا خاکہ بنایا جاتا لیکن یہ معاملہ مختلف نظر آتا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ بانو قدسیہ کی آخری تصانیف میں سے ہے جو کہ اُن کے بڑھاپے کی تصنیف بھی کہلائی جاسکتی ہے اس لیے اس میں فنی حوالے سے کمی نظر آتی ہے اور دوسرا یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بانو قدسیہ نے سوانح نہیں بلکہ اپنی اور اشفاق احمد کی زندگی کی یادداشتوں کو تحریر کر دیا ہو۔

۲۔ زبان و بیان:۔

پلاٹ کے ساتھ ساتھ کسی بھی تحریر کی خوبصورتی کا انحصار زبان و بیان پر ہوتا ہے۔ علم بیان، علم بدیع کا استعمال تحریر کو موثر بناتا ہے۔ اگر ادبی زبان کی بجائے عامیانہ زبان استعمال کی جائے تو تحریر موثر ہو گی اور ادب کو بھی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اردو ادب کی ترقی اور ارتقاء کے لیے ضروری ہے کہ صحیح زبان استعمال کی جائے روزمرہ، محاورہ، علم بیان، علم بدیع، تشبیہ، استعارہ، تلمیح، کنایہ اور مختلف صناع کا صحیح موقع پر صحیح استعمال کیا جائے۔

مصنفہ نے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی، ہندی، پنجابی اور انگریزی الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے۔ انگریزی الفاظ کے استعمال کی مثالیں دیکھیے:

’’اس کتاب سے اب ہم دونوں Commitment کے بند دائرے میں اتر گئے‘‘۔[1]

ایک اور جگہ بیان کرتی ہیں:

"نئے ماحول میں اسے عجیب قسم کی Insecurity کا سامنا رہتا ہے"۔(۲)

بانو قدسیہ کہتی ہیں:

"وہ فیسرین کریم کو Get up اور خوبصورتی عطا کرنا چاہتے تھے۔"۔(۳)

بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

"اس نے کالج کے Rules Violate کیے ہیں"۔(۴)

"تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔There is no first time ہر بار Last time ہوتا ہے"۔(۵)

" راہِ رواں" میں انگریزی الفاظ کا استعمال پنجابی اور ہندی کے مقالے میں زیادہ ملتا ہے۔ اکثر مقامات پر تو بانو قدسیہ انگریزی الفاظ کا استعمال ایسے کرتی نظر آتی ہیں کہ اردو متبادل ہونے کے باوجود بھی وہ انگریزی لفظ استعمال کر دیتی ہیں۔ مثال دیکھیے:

"کچھ مختلف قسم کی بطخیں اور migrat کرنے والے پرندوں کی سرشت میں موسم کی تبدیلی کے ساتھ ہجرت آتی ہے"۔(۶)

مصنفہ ایک ہی جملے میں دونوں الفاظ کا استعمال ایک ساتھ کر رہی ہیں۔

بانو قدسیہ زبان کے معاملے میں جدت پسندی اور قدامت پسندی کا بیک وقت مظاہرہ کرتی ہیں۔ انگریزی جدید زبان ہے جبکہ فارسی قدیم زبان۔ کتاب میں انگریزی الفاظ کا استعمال زیادہ کیا گیا ہے حالانکہ بعض جگہوں پر مصنفہ شوقیہ بھی انگریزی الفاظ کا استعمال کرتی نظر آتی ہیں کیونکہ متبادل اردو الفاظ موجود ہے لیکن بانو قدسیہ بھرتی

کے انگریزی الفاظ استعمال کرتی نظر آتی ہیں۔ بعض جگہوں پر انگریزی الفاظ کا موقع کی مناسبت سے زبردست استعمال بھی نظر آتا ہے۔ اسی طرح اشفاق احمد کی ڈائری کے چند اوراق جو ہندی زدہ اردو میں لکھے گئے ہیں۔ انتہائی مشکل ہندی زبان استعمال کی گئی ہے۔ یہ صفحات بوجھل اور بور محسوس ہوتے ہیں۔ اردو گرائمر کے قواعد کا خیال رکھا گیا ہے۔

بانو قدسیہ کو پنجابی زبان پر بھی دسترس حاصل تھی۔ انہوں نے اپنی تصنیف میں جا بجا پنجابی الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے۔ پنجابی الفاظ کی مثالیں مندرجہ ذیل بیان کی جاتی ہیں۔

"بڈھے ہونا ایک نہایت ہی بُری عادت اے جو نسی انسان بڑی عمر ماں پہنچ کر سکھ جاندا اے۔ اگر اوہ معرف رے اور مسجد آندا جاندا رے اسے بُری عادت پے ہی نہیں سکدی"۔(۷)

پنجابی الفاظ کے استعمال کی ایک اور مثال دیکھیے:

"اماں! میں تیریاں سب بماریاں سن لیاں ایں۔ میں آپ نوں جوان نہیں بنا سکدا۔ اماں بولی میں کد کُنندی ایں جوان بنادے۔ میں تاں کہندی ایں بڑھا، ای بنا دے۔ یہ زاہ ماں کیسا پھسار کھیا اے"۔(۸)

پنجابی الفاظ کی ایک اور مثال:

"واہ جی واہ! ایہہ عینک آپ پر بہت ای سوہنی لگدی اے۔ دس سال جوان لگدے او اپنی عمر تے"۔(۹)

اس کے علاوہ بانو قدسیہ کو ہندی کے الفاظ پر بھی عبور حاصل تھا۔ ہندی الفاظ کی مثالیں دیکھیے:

"اب تو ہم لوگ بھی گلدستے اور کارڈ بھیجنے کو ترجیح دیتے ہیں لیکن ارتکازِ زر اور دولت کے شیدائی ہونے سے پہلے میں اپنا آپ ارپن کرنے کا رواج تھا۔" (۱۰)

ایک اور جگہ بانو قدسیہ بیان کرتی ہیں:

''میں تو اس نظریئے سے لوگوں کے آگے کھان پروستی رہی کہ وہ میری تعریف کریں'' ۔(۱۱)

ہندی الفاظ کی ایک اور مثال دیکھیے:

''شفقی بھیا نمستے''!خوشیوں اور مسرتوں میں ڈوبی ہوئی، دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی شگفتگی اور اطمینان میں بسی ہوئی ننھی سی مبارک باد قبول ہو۔ ''(۱۲)

ہندی الفاظ کی مثال ملاحظہ فرمائیں:

''جٹایو نے کہا'' ہے راکھشس! تیرے انیائے کرنے سے دھرتی ڈانواں ڈول ہو جائے گی اور تیری آتماز ک کا بھتنا بن جائے گی۔ ''(۱۳)

مصنفہ کو فارسی الفاظ پر بھی کمال حاصل ہے۔ فارسی الفاظ کی مثالیں دیکھیے:

''پھر بھی ''ہر کسے رابہ سمت اوست'' کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے قلم اٹھالیا ہے ۔ ''(۱۴)

ایک اور جگہ یوں بیان کرتی ہیں:

''بال اکثرم۔۔۔۔ گرہست شرم۔۔۔۔وان پرست آشرم اور بالآخر سنیاس آشرم۔۔۔۔۔''(۱۵)

ایک اور مثال دیکھیے:

''ہمیشہ ہمیشہ سلامت! باشد!''(۱۶)

یہ تمام الفاظ بانو کی زبان پر دسترس کو ظاہر کرتے ہیں کہ انہیں ان زبانوں پر عبور حاصل تھا۔

" راہِ رواں" میں بانو قدسیہ نے محاورات کا بھی جگہ جگہ استعمال کیا ہے۔

"اُن کی وابستگی چونکہ معروضی اور مزاحمتی ہوا کرتی ہے، بسا اوقات وہ ایسے کیڑے نکال کر ہتھیلی پر دھر دیتے ہیں جن کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔"(۱۷)

ایک اور جگہ بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

"شاید اس گھر کے بڑوں کا خیال تھا کہ تعریف و توصیف سے بچے سر چڑھ جاتے ہیں اور پھر وہ آسمان میں تھگلی لگانے چل نکلتے ہیں۔"(۱۸)

بانو قدسیہ بیان کرتی ہیں، مثال دیکھیے:

"کتاب زندگی کے کچھ اوراق ہم سنیت سنیت کے رکھتے ہیں۔"(۱۹)

ایک اور مثال دیکھیے:

"جناب آپ کے پاس بی اے کی ڈگری ہے اور ہمیں دسویں پاس درکار ہے۔ بی اے پاس نہ تین میں نہ تیرہ میں۔"(۲۰)

۳۔ اُسلوب:۔

کسی بھی تحریر کو دلچسپ، موثر پر کشش اور مقبول بنانے میں سب سے اہم کردار اسلوب کا ہوتا ہے اسلوب کسی بھی مصنف اور ادیب کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔ منفرد اسلوب کے مالک ادیب کسی بھی مصنف اور ادیب کو انفرادی پہچان ملتی ہے۔ صاحب اسلوب ادیب ہی ہمیشہ شہرت اور کامیابی کی منازل طے کرتے ہیں۔ بانو قدسیہ کی تصنیف "راجہ گدھ" انکے مخصوص اسلوب کی پہچان ہے۔ "راہ رواں" کا اسلوب میں سادہ، بیانیہ کہانی

پن کے تمام عناصر موجود ہیں۔ بیانیہ اسلوب ہمیشہ قارئین کی پسند اور توجہ کا مرکز رہا ہے۔ بیانیہ اسلوب میں روانی، بہاؤ، سادگی، عمومیت، واقفیت جیسی خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ نرمی، آہستگی، اعتدال بھی اُسلوب کی خوبیاں ہیں۔ کسی بھی بیانیہ اسلوب کی تین بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں۔ بے ساختگی، برجستگی، اور یجنیلٹی۔ "راہِ رواں" میں بانو قدسیہ کے اسلوب کا جائزہ لیں تو مبالغہ آرائی، افسانوی انداز، داستانوی طرزِ تحریر کی وجہ سے دلچسپی سے پڑھے جانے کے قابل ہے۔

"راہِ رواں" میں بانو قدسیہ افسانوی اور داستانوی اسلوب اختیار کیے ہوئے ہیں اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ سوانح کی صنف کے اسلوب سے اتنی واقف نہیں اور ان کا افسانوی اسلوب زیادہ مضبوط ہے وہ چاہتے ہوئے بھی خود کو اس سے نہیں بچا سکیں اور سوانح میں بھی داستانوی اور افسانوی اسلوب اختیار کر لیں۔

مثال دیکھیے:

"سال بھر سوچنے کے بعد میں نے بڑی مشکل سے اس بات پر اپنے آپ کو راضی کیا ہے کہ آپ کے ساتھ اپنے ہم سفر کو کسی باغ کی اکی بینچ لی پر بیٹھ کر یاد کروں۔ اُوپر سے خزاں دیدی پتے درخت سے گریں، ہوا میں نومبر کے مہینے کی خنکی ہو۔۔۔۔ دُور لان میں میرے بچوں کا بچپن آپ کو نظر آئے، آخری فوارے کے کنارے بیٹھے آپ کو خان صاحب کے دوستوں کا جھرمٹ دکھائی دے۔۔۔۔۔ ہولے ہولے شام کی سرخی غائب ہو جائے، پرندے گھروں کو لوٹ جائیں اور اندھیرے میں کسی گوشے سے خان صاحب آگے بڑھیں اور مجھے میری غلطیوں سمیت اپنے گھر کا بک میں واپس لے جائیں۔"(۲۱)

مذکورہ بالا اقتباس میں بانو قدسیہ کا افسانوی اسلوب کُھل کر سامنے آتا ہے۔ بانو قدسیہ چونکہ ایک صاحبِ طرز ادیب میں افسانے، ناول اور ڈرامے کے حوالے سے اپنی ایک شناخت رکھتی ہیں اس لیے " راہِ رواں" میں بھی اصناف کی جھلکیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ جس طرح ہر ادیب کا اپنا اسلوب ہوتا ہے اسی طرح ہر صنف کا بھی مخصوص اسلوب ہوتا ہے۔ سوانح کی صنف کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس میں غیر ضروری طوالت اختیار نہ کی جائے سوانح چونکہ بذاتِ خود ایک طویل صنف ہوتی ہے تو ایں اگر افسانوی اسلوب اپنایا جائے گا تو یہ طوالت مزید بڑھ جائے گی اور ایسا ہی معاملہ ہمیں " راہِ رواں" میں اکثر مقامات پر نظر آتا ہے۔

۴۔ کردار نگاری:۔

کردار نگاری کے بغیر کوئی داستان، ناول، افسانہ، آپ بیتی اور سوانح نامکمل ہے۔ کرداروں کی وجہ سے تحریر جاندار اور پرکشش ہوتی ہے۔ موضوع اور مواد قارئین کو بھول جاتے ہیں لیکن موثر کردار ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔ کردار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جیتا جاگتا، متحرک، زندہ کردار ہونا چاہیے۔ کردار کا تعلق معاشرے، ماحول، زندگی اور زمینی حقیقت سے ہونا چاہیے۔ کردار کا ذہنی، نفسیاتی تجزیہ ہونا چاہیے۔ کردار کو خوبیوں، خامیوں، عادات، منفی، مثبت کاموں، پسند ناپسند، رجحانات، شوق، خیالات، جذبات، نفسیات، برائیوں، جرائم، اچھائیوں سمیت واضح نظر آنا چاہیے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے کردار فرشتے یا شیطان ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان پر تنقید کی گئی۔ بانو قدسیہ بھی ڈپٹی نذیر احمد کی کردار نگاری سے متاثر نظر آتی ہیں۔ " راہِ رواں" میں موجود تمام کردار ایک رخ، فرشتے ہیں۔ کسی کردار کی کوئی خامی اور ارتقاء نہیں بیان کیا گیا۔ اس لئے مجھے " راہِ رواں" میں کمزور کردار نگاری نظر آتی ہے۔ تمام کردار روحانیت اور تخلیقیت میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تمام کرداروں کے روحانی اور تخلیقی

اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ کوئی ایک بھی ایسا کردار نہیں ہے جسے زندہ جاوید اور یادگار کردار کے طور پر یاد رکھا جائے۔ بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کا کردار پوری تصنیف پر چھایا ہوا ہے۔

اگرچہ " راہِ رواں" کوئی داستان، ناول یا افسانہ نہیں ہے لیکن اس میں بیان کیے گئے کردار ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر " راہِ رواں" کو سوانح قرار دیا جائے تو اس میں کرداروں کو حقیقی اور حقیقت سے قریب ہونا چاہیے تھا تب ہی سوانح کا حق ادا ہوتا ہے لیکن " راہِ رواں" کے کردار روایتی داستانوی کردار معلوم ہوتے ہیں۔ سوانح میں اُس شخصیت کے کرداروں کو نمایاں ہونا چاہیے جبکہ " راہِ رواں" میں اشفاق احمد کے کردار کے ساتھ ساتھ بانو قدسیہ کا کردار بھی اتنا ہی غالب نظر آتا ہے۔ عام طور پر سوانح میں لکھنے والے کی شخصیت کم نظر آتی ہے لیکن سوانح " راہِ رواں" میں اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی شخصیات ساتھ ساتھ چلتی دکھائی دیتی ہیں۔ بانو قدسیہ جہاں اشفاق صاحب کا ذکر کرتی ہیں وہاں اپنا ذکر بھی کر جاتی ہیں۔

صوفیا کے کردار بھی اس کتاب میں شامل ہیں جن میں بابا فضل شاہ نور والے، سخی رازی، سید سرفراز شاہ، واصف علی واصف شامل ہیں۔ تمام صوفیاء کو علم، روحانیت، تصوف، اخلاق، اخلاص، عمل، قول، انسان دوستی کا مرقع قرار دیا گیا ہے۔ صوفیاء کی کردار نگاری میں خاص طور پر ڈپٹی نذیر احمد کے کردار نگاری کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ تمام صوفیاء فرشتہ سیرت دکھائے گئے ہیں۔ بانو قدسیہ صرف محبوب کردار اپنی کتاب میں دکھاتی ہیں۔ لیکن بانو قدسیہ کے سارے کردار پسندیدہ ہیں۔ اشفاق احمد کی شخصیت میں تمام انسانیت کی خوبیاں جمع کر دی گئی ہیں۔ اس لئے اشفاق احمد کا کردار ماورائی، داستانوی محسوس ہوتا ہے۔ کتاب سوانح کی بجائے داستان کا ٹکڑا محسوس ہوتی ہے۔

اشفاق احمد کا قول:

"جو لوگ نعمتوں سے ہاتھ اٹھاتے ہیں وہ Levitation بھی کر سکتے ہیں اور Linear Travel بھی اُن کیلئے مشکل نہیں۔"[۲۲]

اس قول سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان ایک وقت میں دو جگہوں پر موجود ہو سکتا ہے۔

"اشفاق احمد کون تھے؟ میں یہ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ اُن کا مسلک کیا تھا۔"[۲۳]

بانو قدسیہ بھی اشفاق احمد کی باطنی شخصیت سے واقف نہ ہو سکیں۔ انہوں نے اشفاق احمد کو مافوق الفطرت شخصیت بنا کر پیش کیا۔

"عین ممکن ہے کہ میں نے کچھ واقعات غلط، کچھ حادثات بے ربط، کچھ بیانات افراط و تفریط کے ساتھ قلم بند کیے ہوئے ہیں۔"[۲۴]

بانو قدسیہ نے خود تسلیم کیا کہ " راہِ رواں" کے کردار اور واقعات صداقت پر مبنی نہیں ہیں۔ تو اشفاق احمد کا کردار کیسے معروضی اور متوازن ہو سکتا ہے۔ اس لئے مافوق الفطرت کردار بنانے کے لیے اشفاق احمد کو پیش کیا گیا ہے۔

۵۔ جذبات نگاری:۔

جذ بات انسانی فطرت کا حصہ ہیں۔غصہ، خوشی، غم، حیرت، خوف، لالچ، احساس کمتری، احساس برتری، رحم، انتقام، یہ تمام جذبات انسانی نفسیات اور جبلت کا حصہ ہیں۔جب کوئی تحریر وجود میں آتی ہے تو اس کا موضوع انسان، زندگی، معاشرہ ہی ہوتا ہے۔اس لئے انسانی جذبات کی عکاسی ہر تحریر کا موضوع ہوتی ہے۔قارئین پر ہر وہ تحریر، تقریر، آڈیو، ویڈیو دیرپا اثرات چھوڑتی ہے جس میں انسانی جذبات کو فنکارانہ انداز میں الفاظ کا جامہ پہنایا گیا ہو۔سستی جذبات نگاری، سنسنی خیزی ادب کیلئے نقصان دہ ہے۔لیکن اگر کسی تحریر میں جذبات نگاری کی بجائے صرف معروضیت، سنجیدگی، تخیل، عقلیت، سائنسی انداز موجود ہو تو وہ تحریر خشک، بور، غیر ادبی کہلائے گی۔اعلیٰ ادب تحریر کرنے کیلئے مناسب انداز میں جذبات نگاری ضروری ہے۔

جذبات نگاری کی مثال دیکھیے:

''میرے اندر نہ امید تھی نہ امیدی ہی۔۔۔۔۔۔بس ایک کھوکھلا پن تھا جس میں بار بار گاڑی کی وسل بجتی تھی اور بجے ہی چلی جاتی تھی۔''(۲۵)

بانو قدسیہ اشفاق صاحب کے خطوط میں اُن کی جذبات نگاری کی مثال دیتی ہیں:

''میں آپ کو اس وقت سے امی کہتا رہا ہوں جب میں نے آپ کو دیکھا بھی نہیں تھا اور میں آپ کو اس وقت تک امی سمجھتا رہوں گا جب آپ مجھے دیکھا نہ کریں گی۔اگر میں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ارادی یا غیر ارادی طور پر آپ کی ہتک کی ہو یا آپ لوگوں کو ہٹیا سمجھا ہو تو میری دعا ہے کہ میری ایک بیٹی ہو اور میری آنکھوں کے سامنے سرِ بازار اُس کی اوڑھنی اتر جائے۔''(۲۶)

" راہِ رواں"   میں جذبات نگاری کو مناسب نمائندگی دی گئی ہے۔ جذباتی عناصر نہ کم ہیں اور نہ زیادہ۔ بلکہ اعتدال پسندی سے جذبات کی عکاسی کی ہے۔"راہ رواں" کی یہ بہت بڑی خوبی ہے۔ سلجھے ہوئے انداز میں کرداروں کے جذبات پیش کیے گئے ہیں۔" راہِ رواں" جذبات نگاری موثر انداز میں کی گئی ہے۔

۶۔ مکالمہ نگاری:۔

مکالمہ نگاری نثر اور نظم دونوں اصناف میں اہمیت رکھتی ہے۔ شاعری میں سے مثنویوں میں عمدہ درجے کی مکالمہ نگاری کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں اور مکالمہ نگاری نثر کا حسن ہے جبکہ ڈرامہ نگاری میں مکالمہ نگاری جزوِلاینفک ہے۔ آپ بیتی اور سوانح نگاری میں مکالمے کا استعمال کم ہوتا ہے۔ بانو قدسیہ نے بھی راہِ رواں میں مکالمے کا انداز کم اپنایاہے۔ لیکن جہاں مکالمہ نگاری کی گئی ہے انتہائی مختصر، رواں، جاندار، بے تکلف مکالمے تحریر کیے گئے ہیں۔

" راہِ رواں"   کی سب سے بڑی خوبی مکالمہ نگاری ہے۔ بہترین مکالمے اُسی وقت تخلیق ہوسکتے ہیں جب لکھنے والا زبان پر کمال دسترس رکھتاہو۔ بانو قدسیہ کو نہ صرف زبان پر عبور حاصل ہے بلکہ وہ زبان کی تمام ترباریکیوں سے بھی واقف نظر آتی ہیں۔ کہاں سنجیدہ مکالمے لکھنے ہیں کہاں بے تکلف بانو قدسیہ یہ بخوبی جانتی ہیں۔" راہِ رواں" میں مکالمہ نگاری کی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں۔ مثال دیکھیے:

"ناں ناں مسز چٹھ ناں ایسا ظلم نہ کریں۔ پلیز۔۔۔۔اسے ایم اے کرنے دیں۔ شادی کونسی بھاگی جاتی ہے۔ ذرا میچور ہولینے دیں۔۔۔۔ساری عمر پڑی ہے شادی کے لیے۔"[۲۷]

ایک اور جگہ مکالمے کی مثال دیکھیے:

"جی ایک عرض کرنا تھی۔۔۔۔اگر آپ کے پاس وقت ہو۔

جی بابو جی

ویسے تو جی مجھے دخل دینے کی ضرورت نہیں، لیکن میں چھوٹی بی بی کو تب سے جانتا ہوں جب

میں دھر، سالے آیا کرتا تھا۔ وہ بہت بھولی روح ہے۔

ایسی روحوں کی نگرانی کرنا پڑتی ہے۔ "(۲۸)

بانو قدسیہ کے مقالوں میں بے ساختگی، بے تکلفی اور برجستگی ہے۔ عموماً سوانح مکالمے کم پائے جاتے ہیں لیکن " راہِ رواں" میں ہمیں مکالموں کی کافی تعداد ملتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہاں بھی بانو قدسیہ کا وہ رنگ غالب ہوتا نظر آتا ہے وہ ان کی شناخت ہے۔ سوانح بانو قدسیہ کا مزاج نہیں ہے اسی لیے " راہِ رواں" میں ہمیں سوانح سے ہٹ کر دیگر افسانوی اصناف کی جھلک زیادہ نظر آتی ہے۔

۷۔ خاکہ نگاری:۔

" راہِ رواں" میں متعدد شخصیات کے خاکے بھی ملتے ہیں بظاہر یہ کمزور خاکے معلوم ہوتے ہیں اور خاکے کے فن پر پورے نہیں اُترتے لیکن یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ مصنفہ کا مقصد خاکہ نگاری نہ تھا۔ ان میں سے آٹھ خاکے ڈاکٹر صاحبان کے ہیں۔ جنہوں نے بانو قدسیہ اور اُسکی فیملی کا علاج کیا۔ دس خاکے خواتین کے ہیں۔ خواتین میں مشہور ادیبہ اور شاعرات شامل ہیں۔ جبکہ باقی چھیالیس خاکے مختلف ادیبوں، صحافیوں، شاعروں اور ذاتی دوستوں کے ہیں۔ تمام خاکے انتہائی کمزور خاکے معلوم ہوتے ہیں۔ خاکوں میں جو خوبیاں، خصوصیات ہوتی ہیں کسی ایک خاکے میں بھی موجود نہیں۔ سراپا نگاری خاکے کی بنیادی صفت ہے لیکن " راہِ رواں"میں یہ بنیادی خوبی بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ حالانکہ تصنیف اشفاق احمد کی سوانح ہے۔ تو اس میں دیگر شخصیات کے طویل خاکے پیش

غیر اہم اور اضافی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ خاکے شامل ہونے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مصنفہ سب سے کسی نہ کسی حد تک متاثر تھیں۔ خاکے در اصل خاکہ نگاری کے بنیادی اصول و قواعد اور لوازمات کو بھی پورا نہیں کرتے اور یہ غیر اہم حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ اردو ادب میں جو خاکہ نگاری کی اچھی روایت موجود ہے۔ یہ خاکے اُس روایت کا تسلسل نہیں کہے جاسکتے۔

وزیر آغا اور انور سدید جیسی شخصیات کے بارے میں بانو لکھتی ہیں:

''وزیر آغا بڑے مشفق ہیں۔ ذرا مشکل پسند ہیں اپنی نظموں اور نثر میں مشکل پسندی کی روایات کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن سٹائل کی مشکل پسندی کے باوجود طبیعت بڑی آسانیاں عطا کرنے والی ہے۔ ایسا تضاد بڑا خوش آئند ہے۔ اللہ کرے تادیر یہی فضاء قائم رہے۔''(۲۹)

انور سدید کا خاکہ ملاحظہ فرمائیں:

''ان میں مجھ میں ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ ہم دونوں ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے۔ ہم دونوں کا برج ''قوس'' ہے۔ عین ممکن ہے کہ اسی برج کے اثرات ہم دونوں پر ایک سے مرتب ہوتے ہیں۔''(۳۰)

انور سدید کا خاکہ بھی در اصل خاکہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ دونوں خاکے ہی نامکمل اور ادھورے ہیں کیونکہ بانو قدسیہ کا مقصد خاکہ نگاری نہ تھا۔ یہاں تک یہ اشفاق احمد کا بھی کوئی واضح خاکہ '' راہِ رواں''میں نہیں ملتا۔

۸۔ شخصیت نگاری:۔

آپ بیتی یا سوانح کی سب سے بڑی خوبی شخصیت نگاری ہے۔ شخصیت نگاری سے مراد کسی بھی شخص کی مکمل لفظی تصویر ہے۔ اُسکی عادات، شکل صورت، قد کاٹھ، وضع قطع، خد وخال، آواز، گفتگو، چال ڈھال، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، خیالات، جذبات، رجحانات، عادات، شوق، نفسیات، فطرت، نشت وبرخاست، خوبیاں، خامیاں، صلاحیتیں، ہنر، مہارتیں، آداب، تہذیب، لباس، شخصیت نگاری میں شامل ہیں۔ شخصیت نگاری میں کسی بھی شخص کے مثبت اور منفی دونوں پہلو، اچھائی، برائی، نیکی، بدی شامل ہیں '' راہِ رواں'' میں تو کسی بھی کردار کی مکمل شخصیت ابھر کر سامنے نہیں آتی۔ حتیٰ کہ اشفاق احمد جن کی شخصیت پر یہ تصنیف لکھی گئی ہے۔ ان کی شخصیت کی بھی ادھوری اور نامکمل تصویر سامنے آتی ہے۔ بانو قدسیہ کا مزاج ہی ایسا ہے کہ وہ صرف مثبت پہلو ہی دیکھ پاتی ہیں۔ اس لئے وہ کرداروں کے روشن پہلوؤں کو صرف اُجاگر کرتی ہیں۔ کرداروں کے منفی پہلو بیان نہیں کر سکتیں۔ اس لئے اُن کی ''راہِ رواں'' کی بہت بڑی خامی شخصیات کی نامکمل اور ادھوری تصویریں ہیں۔ ادبی، فنی، فکری لحاظ سے یہ ادھوری سوانح ہے۔ نامکمل آپ بیتی ہے۔ سچائی اور صداقت کے پہلو چھپائے گئے ہیں۔ سوانح عمری اور آپ بیتی کی بنیادی خوبی حقیقت پسندی اور صداقت پسندی ہے۔ لیکن بانو قدسیہ مثالیت پسند اور رومانیت پسند واقع ہوئی ہیں۔ سوانح نگار کو مورخ کی طرح سچائی سامنے لانی چاہیے جبکہ بانو قدسیہ کا مزاج، محقق اور مورخ سے بہت مختلف ہے۔ وہ صرف شخصیتوں کے روشن، مثبت پہلو اور خوبیاں تحریر کر سکتی ہیں۔ اور '' راہِ رواں'' میں بھی تصویر کا ہی رُخ دکھایا گیا ہے۔

۹۔ بیانیہ انداز:۔

فنی حوالے سے '' راہِ رواں'' کی اہم ترین خوبی بیانیہ انداز ہے۔ واقعہ نگاری، روانی، دلچسپی، تاثیر جیسی خو بیاں اسی بیانیہ انداز کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ بانو قدسیہ کامیابی سے فنی پختگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمام واقعات کو

اپنے بیانیہ طرزِ تحریر کی بدولت دلکش، حیران کن اور پر تجسس بنا دیتی ہیں۔ واقعات میں حسن اور تاثیر پیدا کر دیتی ہیں۔ عام طور پر طرزِ تحریر سے متاثر ہو کر معلومات کی صداقت اور معروضیت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ دلکش اور رواں سٹائل میں غیر حقیقی واقعات لکھے جائیں تو سچ معلوم ہوتے ہیں۔ جبکہ آپ بیتی اور سوانح نگاری میں فنی لوازمات کے ساتھ ساتھ معروضیت اور صداقت بھی انتہائی ضروری ہوتی ہے۔ اردو کی داستانوں، افسانے اور ناول میں فینسٹی ایک خوبی تصور کی جاتی ہے لیکن آپ بیتی اور سوانح میں یہ خامی سمجھی جاتی ہے۔ فنی نکتہ نظر سے بیانیہ اسلوب ''راہِ رواں'' میں اختیار کیا گیا ہے۔ کامیاب ترین تجربہ ہے۔ بیانیہ انداز کی وجہ سے عام قارئین تک مکمل ابلاغ ہو جاتا ہے۔ بانو قدسیہ بھی پاکستانی معاشرے کے عام آدمی کی ذہنی سطح کو متاثر کرنا چاہتی ہیں۔ اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب نظر آتی ہیں۔

بانو قدسیہ نے اس طرح کے بہت سے واقعات خوبصورت انداز تحریر میں بیان کیے ہیں۔ اگر مصنفہ داستان لکھ رہی ہوتیں تو یہ انداز اور واقعہ قابل تعریف تھے لیکن آپ بیتی یا سوانح کے لیے یہ انداز مناسب نہیں۔ بیانیہ اسلوب افسانے کے لیے تو مناسب ہے مگر '' راہِ رواں'' اگر سوانح ہے تو اس کے لیے یہ اسلوب مناسب نہیں۔ بانو قدسیہ ناول نگار اور افسانہ نگار بھی تھیں تو یہ افسانوی انداز '' راہِ رواں'' میں بہت واضح دیکھا جا سکتا ہے۔ مثال دیکھیے:

> ''مزنگ روڈ میں مفتی جی، محمد حسین، زوبی صاحب اور کبھی کبھار شہاب صاحب آتے جاتے رہتے۔ لیکن اشفاق احمد رفتہ رفتہ وہ گُم سم گونگے بن گئے جو اپنے کنوئیں کے پانیوں میں نہ تو کسی کو جھانکنے دیتا ہے نہ ٹھنڈے پانی کا چلو بھر پینے کی اجازت ہوتی ہے۔ ''[۳۱]

ایک اور جگہ لکھتی ہیں:

''پتہ نہیں ڈر کیا ہے۔ کیوں لگتا ہے۔ کیسے لگتا ہے اور آج مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے رات کو کوئی آ کر میرا گلا گھونٹ دے گا۔ میں سمجھوں گا میں مر گیا لیکن میں مروں گا نہیں۔ آدمی یہ سمجھے گا کہ میں مر گیا ہوں اور وہ نہ مرے! کیسی خوفناک بات ہے۔ آدمی یہ سمجھے کہ میں زندہ ہوں اور وہ جی نہ رہا ہو کس قدر کربناک بات ہے۔ ''(۳۲)

مندرجہ بالا دونوں اقتباس پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ کسی افسانے کے اقتباسات ہوں۔ بلاشبہ بانو یہ صاحبِ طرز ادیب ہیں او یہی وجہ ہے کہ وہ سوانح میں بھی افسانے کا سا انداز اپنا جاتی ہیں کیونکہ افسانہ اور ناول ان کے میدان ہیں جبکہ سوانح ان کا میدان نہیں۔ اسی لیے '' راہِ رواں ''میں افسانے کا سا بیانیہ ملتا ہے۔

۱۰۔ شائستگی:۔

اگرچہ ''راہ رواں'' میں فکری کمزوریاں موجود ہیں لیکن اس کا فنی حوالہ قدرے مضبوط نظر آتا ہے۔ بانو قدسیہ کی اس تحریر کی نمایاں خوبی شائستگی ہے۔ اندازِ تحریر میں سنجیدگی، سلجھا پن، دھیما پن ہے۔ انہی خوبیوں نے '' راہِ رواں'' کو موثر، دلچسپ، حسین اور دلکش بنا دیا ہے۔ تہذیب، تمیز، ادب واحترام سے اپنے نظریات وخیالات کو بیان کیا گیا ہے۔ تلخی، ترشی، غصے، زہرناکی، جذباتیت، طنز، تعریفیں، تحقیر، تذلیل، توہین ڈھونڈ نے سے بھی اس '' راہِ رواں '' میں نہیں ملتی۔ مصنفہ خود شائستہ اور سلیقہ مند خاتون تھیں۔ رجعت پسند ادیبہ تھیں۔ چادر اور چار دیواری کا تقدس انہوں نے ساری زندگی بر قرار رکھا۔ مشرقی شرم، حیاء، شرافت اور نجابت کی دال دادہ تھیں۔ اس لئے اشفاق احمد سے محبت تو کی لیکن محبت میں تقدس کا پاس رکھا۔ محبت میں حجاب، پردہ اور گھریلو روایات موجود تھیں۔ مذہب، تصوف اور اخلاق کے نظام کی پاسداری کرتی رہیں۔ اس لئے ''راہ رواں'' میں شا ئستگی کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ انہوں نے بہت سے کردار بیان کئے لیکن کسی کردار کی جنسی زندگی کی جھلک تک

نظر نہیں آتی، حتیٰ کہ شائستگی کی حدود مبالغہ آرائی سے جا ملتی ہے کیونکہ عدم صداقت، تخیل آرائی، داستان طرازی، افسانوی انداز اور گھریلو پن بھی اسی شائستگی کا نتیجہ ہے۔

بانو قدسیہ کسی کردار کی باطنی حقیقت اور عیب بیان نہیں کرتیں۔ شائستہ رویہ اپنا کر تمام کرداروں کے عیوب کی ستر پوشی کرتی ہیں اور صرف خوبیاں بیان کرتی نظر آتی ہیں۔

بانو قدسیہ کے بقول:

''مجھ پر اپنی اور خان صاحب کی اندرونی جبلت، فطرت، طبیعت، کردار کے اصل بھید نہیں کھلے۔''(۳۳)

ایک اور مثال دیکھیے:

''غلط قدم اُٹھانا تو دور کی کوڑی لانا تھا۔ میں تو سیدھے سبھاؤ کسی سے بات کرنے کی اہل نہ تھی۔''(۳۴)

بانو قدسیہ فطرتاً شائستہ تھیں اسی وجہ سے یہ شائستگی اُن کی تحریر میں بہت واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔

۱۱۔ نسوانیت:۔

بانو قدسیہ نے زیادہ وقت گھر رہ کر گزارا۔ اس لئے ''راہِ رواں'' میں گھریلو پن، نسوانیت کے نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ خاندانوں، رشتوں کی تفاصیل، رہائش گاہوں کی جزیات نگاری اور وضاحت بھی نسوانیت کے لوازمات ہیں۔ بانو نے ان تمام چیزوں کو عورت کی نظر سے دیکھا ہے اور اُسی طرح تحریر کیا ہے جیسا ایک عورت سوچتی ہے۔ بانو قدسیہ نے اشفاق احمد کے تمام رشتہ داروں کے نام، پیشے، عمریں بیان کی ہیں۔ ''راہِ رواں'' کو پڑھتے ہوئے

نسوانی نثر کا احساس ہوتا ہے۔ گھریلو پن، سگھڑ پن اور سلیقہ مندی جیسی خوبیاں بانو قدسیہ کے ساتھ ساتھ ان کی نثر میں بھی جابجا نظر آتی ہیں۔ نفاست، احتیاط، اعتدال، اختصار، کفایت شعاری ایک سمجھ دار گھریلو خاتون کی خوبیاں سمجھی جاتی ہیں۔ بانو قدسیہ بھی گھریلو تھیں اس لئے ان کے خیالات، جذبات، تجربات، مشاہدات اور طرزِ تحریر میں نسوانی خوبیاں موجود ہیں۔ مخلوط سماجی تقریبات میں بانو قدسیہ بہت کم شرکت کرتی تھیں۔ گھریلو زندگی گزارتی رہیں۔ اس لئے اُنکی شخصیت اور تحریر میں گھریلوپن کی چھاپ نظر آتی ہے۔ فنی حوالے سے نسوانی نثر میں لچک، نرمی، نفاست، نزاکت، احتیاط، خوف، مرعوبیت، تقلید، شائستگی، ستر پوشی، جیسی خصوصیات شامل ہوتی ہیں۔

مثال دیکھیے:

''میں طبعاً ڈرپوک ہوں۔ خوف میری شخصیت کا بنیادی وصف ہے۔''(۳۵)

۱۲۔ داخلیت اور خارجیت:۔

''راہ رواں'' کی فنی خوبی داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج ہے۔ کرداروں کے داخلی جذبات، روحانی اضطراب کو بھی پیش کیا گیا ہے اور انکے خارجی دنیا کے معاملات اور مسائل بھی پیش کیے گئے ہیں۔ بانو قدسیہ خاندان، فیملی، رشتوں، دنیاوی پیشوں کی تفاصیل بھی بیان کرتی ہیں اور ساتھ ساتھ کرداروں کی تلاش خدا، روحانیت، تصوف اور مذہبی معاملات بھی پیش کرتی نظر آتی ہیں۔ اس لئے بانو قدسیہ نہ صرف داخلیت پسند ادیبہ ہیں اور نہ ہی خارجیت پسند۔ بلکہ اس حوالے سے اعتدال اور میانہ روی اپنائے ہوئے ہیں۔ کچھ سوانح نگار کرداروں کی صرف داخلیت کو اجاگر کرتے ہیں اُنکے خیالات، جذبات، نفسیات، ذہنی ارتقاء کو پیش کرتے ہیں اور کچھ ادیب سراپا نگاری، عادات، گفتار، لباس، رجحانات بیان کرتے ہیں۔ لیکن ''راہ رواں'' میں یہ دونوں فنی خصوصیات موجود ہیں۔

۱۳۔ گہری معنویت:۔

''راہِ رواں'' کو پڑھتے ہوئے جو چیز سب سے دلچسپ اور دلفریب لگتی ہے وہ بانو قدسیہ کا گہرا مشاہدہ اور باریک بینی ہے جس کی وجہ سے اکثر مقامات پر وہ چھوٹے چھوٹے فقروں میں اتنی گہری بات کر جاتی ہیں کہ قاری حیران رہ جاتا ہے۔ ایسا کوئی بڑا ادیب ہی کر سکتا ہے۔ بانو قدسیہ صاحب طرز ادیب ہیں یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ بانو قدسیہ کا مزاج سوانحی ادب لکھنے کے لیے موزوں نہیں ہے لیکن پھر بھی انہوں نے ''راہِ رواں'' میں بعض مقامات پر قاری کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور قاری ان کے گہرے مشاہدے کی داد دیئے بنا نہیں رہ سکتا۔

ایک جگہ لکھتی ہیں:

''سفید قومیں، سیاہ اور براؤن جلا کو بھی معاف نہیں کرتیں اور عموماً ایسے درجہ خود پرست ہوتی ہیں کہ وہ سیاہ شکل وصورت واے فرد کو مکمل طور پر ہی رد کر دیتی ہیں۔''[۳۶]

بظاہر انہوں نے یہ جملے دوست محمد خان کے حوالے سے لکھے ہیں کیونکہ وہ خوبصورت تھے اور اُن کی بیوی سانولی اور معمولی شکل وصورت کی تھی لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ جملے برصغیر کے پس منظر کے حوالے سے اپنے اندر گہری معنویت رکھتے ہیں۔ تاریخ نے ایک اہم دور کو بانو قدسیہ چند جملوں میں اتنی آسانی سے بیان کر گئیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک صاحبِ طرز ادیب ہیں سوانح ان کا میدان نہ ہی لیکن انہوں نے بعض مقامات پر کمال دکھایا ہے۔

''راہِ رواں'' میں بانو قدسیہ کے ہاں ایک اور اہم جات یہ دیکھنے کو ملتی ہے کہ ان کا زندگی کے حوالے مشاہدہ بہت گہرا ہے وہ اس ضرورت سے پوری طرح آشنا نظر آتی ہیں کہ نئی تہذیب اور نئے کلچر کے شور میں ہمیں اپنے تبدیلی ورثے کو بھولنا نہیں چاہیے پنجاب کی ثقافت کا بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

بانو قدسیہ کے بقول:

دوست محمد خان صاحب کو لسی، بنی روٹی، سرسوں کا ساگ، کڑہی، بڑیاں کھانے کا شوق ڈول دیا۔''[۳۷]

''راہِ رواں'' میں واقعات اور معلومات میں کس حد تک صداقت سے اس سے قطع نظر ہمیں اس بات کا اقرار کرنا چاہیے کہ بانو قدسیہ ایک وسیع المطالعہ شخصیت کی حامل تھیں اور ان کا یئہ مطالعہ ''راہِ رواں'' میں جابجا نظر آتا ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ انہوں نے سوانح کی صنف سے انصاف نہیں کیا اور اشفاق احمد کی سوانح لکھتے لکھتے وہ آپ بیتی کے زیادہ قریب ہو گئیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے بعض مقامات پر خوبصورتی سے بیان کرتے ہوئے قاری کی دلچسپی کا سامان پیدا کیا ہے۔

مختصراً یہ کہ ''راہ رواں'' کا فکری پہلو چاہے کمزور سہی لیکن اس کا فنی پہلو خاصا متوازن اور مضبوط نظر آتا ہے۔ ''راہ رواں'' سوانح ہے یا نہیں اس سے قطع نظر اس میں فنی حوالے سے قاری کی دلچسپی کا پورا سامان موجود ہے۔عام قاری واقعات کی صحت کو نظر انداز کر کے دلچسپی سے اس تصنیف کو نہ صرف پڑھ سکتا ہے بلکہ لطف اندوز بھی ہو سکتا ہے مگر ادب کا ایسا قاری جو اس پر تحقیق کرے گا وہ اس کے فکری پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ بانو قدسیہ کا انداز ایسا ہے کہ پڑھنے والا اُس کی روانی میں بہتا چلا جاتا ہے افسانوی رنگ غالب ہونے کی وجہ سے سوانح جیسی غیر دلچسپ تصنیف میں بھی رنگا رنگی نظر آنے لگتی ہے اور قاری اسے نہ صرف پڑھتا ہے بلکہ محفوظ بھی ہوتا ہے۔ بانو قدسیہ اپنے قاری کی ذہنی تربیت کا سامان بھی پیدا کرتی نظر آتی ہیں جہاں انہیں ضرورت پیش آتی ہے وہ لمبی تمہیدیں باندھ کر نصیحت آموز انداز اختیار کر لیتی ہیں اور ایسے درس دیتی محسوس ہوتی ہیں جو عموماً مذہبی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود ''راہ رواں'' اپنی فنی خوبیوں کی وجہ سے ایک اہم اور دلچسپ صنف قرار دی جاسکتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ بانو قدسیہ، ''راہِ رواں''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱، ص۹

۲۔ ایضاً، ص۱۳

۳۔ ایضاً، ص۲۹

۴۔ ایضاً، ص۷۰

۵۔ ایضاً، ص۷۰

۶۔ ایضاً، ص۱۳

۷۔ ایضاً، ص۶۲

۸۔ ایضاً، ص۶۲

۹۔ ایضاً، ۶۲

۱۰۔ ایضاً، ص۱۱

۱۱۔ ایضاً، ص۶۸

۱۲۔ ایضاً، ص۱۰۸

۱۳۔ ایضاً، ص۳۲۳

۱۴۔ ایضاً، ص۸

۱۵۔ ایضاً، ص۹۷

۱۶۔ ایضاً، ص۱۰۸

۱۷۔ ایضاً، ص۸

۱۸۔ ایضاً، ص۵۹

۱۹۔ ایضاً، ص۸۳

۲۰۔ ایضاً، ص۳۵

۲۱۔ ایضاً، ص۸

۲۲۔ ایضاً، ص۴۱

۲۳۔ ایضاً، ص۳۴۔ ۴۲

۲۴۔ ایضاً، ص۵۷

۲۵۔ ایضاً، ص۱۴۵

۲۶۔ ایضاً، ص۱۱۹

۲۷۔ ایضاً، ص۳۷

۲۸۔ ایضاً، ص۸

۲۹۔ ایضاً، ص۳۷

۳۰۔ ایضاً، ص۴۵۵

۳۱۔ ایضاً، ص۵۷

۳۲۔ ایضاً، ص۵۷

۳۳۔ ایضاً، ص۸

۳۴۔ ایضاً، ص۳۷

۳۵۔ ایضاً، ص۴۵۵

۳۶۔ ایضاً، ص۱۴

۳۷۔ ایضاً، ص۱۸

باب چہارم:

مجموعی جائزہ

اشفاق احمد ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء کو مشرقی پنجاب کے شہر فیروز پور میں پیدا ہوئے ۔ گاؤں کا نام میکستر تھا جو سکھوں کا ایک مقدس مقام تھا۔ ۱۹۵۰ء میں ایم۔اے۔ اردو کیا۔ اطالوی اور فرانسیسی زبان میں ڈپلومے کیے۔ بچپن فیروز پور شہر میں گزرا۔ جب پاکستان بنا تو ہجرت کر کے لاہور آ گئے۔ ریلوے اور والٹن کیمپ میں ملازم رہے۔ دیال سنگھ کالج لاہور اور روم یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرار رہے۔ رسالہ ''لیل و نہار'' اور ''داستان'' کے مدیر رہے۔ اردو سائنس بورڈ کے ڈائریکٹر رہے۔ ریجنل کلچرل انسٹیٹوٹ پاکستان کے بھی ڈائریکٹر رہے۔ اپنی پسند اور مرضی سے ۱۹۵۶ء میں بانو قدسیہ سے شادی کی۔

تین افسانوی مجموعے لکھے جن میں ''ایک محبت سو افسانے''، ''اجلے پھول'' اور ''سفر مینا'' شامل ہیں۔ ''مہمان بہار'' اُن کا مشہور ناولٹ ہے۔ ''کھیل تماشا'' بھی ناولٹ ہے۔ تراجم میں ''وداع جنگ''، ''چنگیز خان کے سنہری شاہین'' شامل ہیں۔ ''سروں سے نباہ'' بھی ترجمہ شدہ تحریر ہے۔ ٹی وی ڈرامے بھی لکھے جن میں '' شورا شوری''، ''ڈھنڈورا''، ''دھنیگا مشتی''، ''حسرتِ تعمیر''، '' جنگ بجنگ''، ''گلدان''، '' من چلے کا سودا''، ''مہمان سرائے''، ''شاہلا کوٹ''، ''توتا کہانی''، ''حیرت کدہ''، اور ''ڈرامے''، ''ننگے پاؤں''، ''قلعہ کہانی''، ''ایک محبت سو افسانے'' شامل ہیں۔ '' تلقین شاہ'' پروگرام ریڈیو پر ۳۹ سال نشر ہوتا رہا۔ ''زاویہ'' پروگرام پاکستان ٹیلی وژن سے نشر ہوتا رہا۔ اشفاق احمد نے پنجابی میں بھی ڈرامے لکھے جن میں ''ٹاہلی تھلے'' اور ''اُچ برج لہور دے'' شامل ہیں۔ ''دھوپ اور سائے'' فلم بھی بنائی۔ اُن کا ایک

مشہور سفر نامہ بھی ہے جس کا نام ''سفر در سفر'' ہے۔ اُنکی تحریروں کے موضوعات میں محبت، تصوف، نیکی، اسلام، پاکستان، ہجرت اخلاقیات شامل ہیں۔ ہجرت کے موضوع پر ''گڈریا'' جیسا افسانہ لکھنے پر انہیں ملک گیر شہرت ملی۔ انہوں نے پنجابی میں بھی شاعری کی۔ اُن کا ایک مجموعہ ''کھٹیا وٹیا'' کے نام سے شائع ہوا۔ اشفاق احمد نے سات ستمبر ۲۰۰۴ء کو لاہور میں وفات پائی۔ اشفاق احمد ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ افسانہ نویس، ڈرامہ نویس، سفر نامہ نگار، دانشور، صداکار اور منتظم تھے۔ اشفاق احمد صوفی تھے یا نہیں تھے؟ میرے خیال میں اشفاق احمد ولی یا صوفی بالکل نہیں تھے۔ بلکہ انہوں نے اپنی تحریروں میں لوک دانش، اقدار وروایات کو سمویا۔ وہ پڑھے لکھے، تعلیم یافتہ انسان کی دانش، علم اور تجربے کی بجائے ان پڑھ لوگوں کی دانش، علم اور تجربات کو ترجیح دیتے اور اپنی تحریروں میں شامل کرتے۔ اشفاق احمد پاکستان کے حکمران، مقتدر طبقات اور اشرافیہ کے قریبی دوست رہے۔ اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ رائٹر گلڈ، اردو سائنس بورڈ سے وابستہ رہے۔ قدرت اللہ شہاب کے دوست رہے۔ اشفاق احمد اسٹیبلشمنٹ کے قریب رہے جس کی وجہ سے اُن پر خاصی تنقید بھی کی گئی۔ اُن کے دو قریبی دوستوں اے حمید اور ممتاز مفتی نے بھی اُن کی شخصیت پر تنقید کی۔ اشفاق احمد کا نظریہ تصوف متنازعہ ترین ہے۔ روایتی مذہبی حلقوں، ادبی، علمی، فکری حلقوں کی طرف سے اس نظریہ پر سخت تنقید کی گئی۔ جدید دور کے ادیب، شاعر اور دانشور اشفاق احمد کے نظریہ تصوف سے سخت اختلاف کرتے ہیں۔ اُن کے خیال میں اُن کا یہ نظریہ علم دشمنی، سائنس دشمنی، تقدیر پرستی، بے علمی، عقل دشمنی کا مجموعہ ہے جو معاشرے کی ترقی، ارتقاء اور خوشحالی کیلئے نقصان دہ ہے۔ اشفاق احمد نے اپنی تحریروں میں لوک دانش اور تصوف کو شامل کیا۔ کیونکہ پاکستانی معاشرے کا عام آدمی ان نظریات کو پسند کرتا ہے۔ حکمران طبقات بھی ان نظریات کے حامل ادیبوں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ اشفاق احمد اَن پڑھ بابوں کی دانش سے متاثر تھے۔ اُن کے خیال میں پڑھے لکھے لوگوں نے ملک کو زیادہ نقصان پہنچایا ہے جبکہ اَن پڑھ بابوں نے معاشرے اور عام آدمی کو فائدہ پہنچایا ہے۔ بابے، عام آدمی کو سکون، اطمینان اور امید دیتے ہیں۔ اشفاق احمد، میرے خیال میں صوفی یا ولی اللہ نہیں تھے۔ جو لوگ انہیں یہ درجہ دیتے ہیں وہ ضعیف الاعتقادی کا شکار ہیں۔ البتہ اشفاق احمد قابلِ ذکر ادیب اور دانشور ضرور تھے۔ خوش گفتار ذہن، معاملہ فہم، زمانہ ساز، دنیادار، مردم شناس

انسان تھے۔ تحریر اور تقریر کے جادو گر تھے۔ سحر انگیز گفتگو اُن کی شخصیت کی بہت بڑی خوبی تھی۔ اشفاق احمد کا حافظہ شاندار تھا۔ وسیع المطالعہ تھے۔ ان خوبیوں کی وجہ سے ادب اور دنیاداری کے میدان میں ترقی اور کامیابی حاصل کی۔ اشفاق احمد کے نظریہ تصوف کے درج ذیل اجزاء تھے۔مافوق الفطرت، قول، علم، عمل، اخلاص، خدمت خلق، معجزات، کرامات، روح، صبر وشکر، توکل، مہمان نوازی، درویشی، مراقبہ، تصور شیخ وغیرہ۔

اشفاق احمد کی شخصیت کا جائزہ لینے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ صوفی نہیں تھے تصوف کی ان پندرہ خوبیوں کے حامل نہیں تھے۔ سب سے پہلی خوبی مافوق الفطرت عناصر ہیں۔ صوفی اس طاقت کا حامل ہوتا ہے۔صوفی موت کو روک سکتا ہے۔ کسی کو زندگی عطا کر سکتا ہے۔ بابا فضل شاہ جو اشفاق احمد کے نظریہ تصوف پر پورا اترتے تھے۔ بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کی رائے میں وہ زندگی، موت کے فیصلے تبدیل کر سکتے تھے۔ جبکہ حقیقت میں صوفی کے پاس یہ اختیارات اور طاقت نہیں ہوتی۔ اشفاق احمد ساری زندگی ایسا کوئی مافوق الفطرت کام نہیں کر سکے۔ اشفاق احمد کی رائے کے مطابق صوفی ایک وقت میں دو جگہوں پر بھی موجود ہو سکتا ہے۔ جبکہ "راہِ رواں " سے ایسا کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ اشفاق صاحب ایک وقت میں دو جگہ پائے گئے ہوں۔ تصوف کی دوسری خوبی قول اور گفتگو ہے۔ خوش گفتاری، خوش کلامی، نرم دھیمی گفتگو، شائستگی، تہذیب، آداب، اخلاق، پُر تاثیر اقوال ہے۔ اشفاق احمد فنِ تقریر، فنِ گفتگو، صداکاری، سحر انگیز گفتگو کا ملکہ رکھتے تھے۔ نظریہ تصوف کی دوسری خوبی کے مالک تھے۔ تیسری خوبی علم ہے اشفاق احمد پڑھنے لکھنے کے شوقین اور کتابوں سے محبت کرنے والے انسان تھے۔ اُنکا مطالعہ وسیع، متنوع اور گہرا تھا۔ تصوف اور ادب کی روایات اور تاریخ سے واقف تھے۔ وہ عالم، فاضل، پڑھے لکھے، تعلیم یافتہ انسان تھے۔ چوتھی خوبی عمل ہے۔ صوفی باعمل، باکردار ہوتا ہے۔ اپنے تمام اقوال پر سو فیصد عمل کرتا ہے۔ گفتگو کی بجائے اپنے مثالی کردار، اچھے اعمال، حسن سلوک اور شخصیت سے دوسرے انسانوں کو متاثر کرتا ہے۔ سچائی، ایثار، قربانی، شرافت، نیکی انسان دوستی، وسیع القلبی، نفرت، غصہ، بغض، انتظام ہوتا ہے۔ زمانہ سازی، موقع پرستی، احسان فراموشی، کم ظرفی، تنگ نظری، مکاری، منافقت اور مفادات جیسی کمزور صفات کا حامل نہیں ہوتا۔ اب اشفاق احمد کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو وہ عام انسان تھے اور اُن کا طرزِ عمل بھی عام انسانوں کا سا

تھا۔ اس لیے یہ چوتھی خصوصیت اخلاص ہے۔ ریاکاری، نمود و نمائش، خود ستائی، خوشامد، خود غرضی اور لالچ جیسی خامیاں ، ہدایت یافتہ صوفی میں موجود نہیں ہوتیں۔ جبکہ اشفاق صاحب احساسِ برتری اور نرگیسیت کا شکار نظر آتے ہیں۔ اپنی تحریر و تقریر کی داد و تحسین کے خواہش مند تھے۔ مقبولیت اور شہرت کے دلدادہ تھے۔ نرگیسیت پسندی ایک بڑے ادیب کی خوبی سمجھی جاتی ہے جبکہ عظیم صوفی کی خامی سمجھی جاتی ہے۔ تصوف کی چھوٹی خوبی خدمت خلق ہے۔ دکھی انسانیت کی مدد کرنا۔ اشفاق احمد کی گھریلو، ذاتی اور پروفیشنل مصروفیات بہت زیادہ تھیں۔ اُنکے پاس اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اور کردار سازی کا وقت نہیں تھا۔ خدمتِ خلق کیلئے وقت اور وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اشفاق احمد کے پاس نہ ہی ٹائم تھا اور نہ وسائل۔ اس لئے خدمت خلق اُن کی شخصیت، مزاج اور مصروفیات کی وجہ سے ممکن نہیں تھی۔ تصوف کی چھٹی خصوصیت کے اشفاق احمد حامل نہیں تھے۔ تصوف کی ساتویں اور آٹھویں خصوصیت معجزات، کشف و کرامات ہیں۔ اشفاق احمد تمام کشف و کرامات کے تہہ دل سے قائل تھے۔ لیکن خود ساری زندگی کسی قسم کی کرامات نہ دکھا سکے۔ بڑے عظیم صوفیاء کرام کے کشف و کرامات کے قصے سناتے تھے۔ وہ کثیف صوفی نہیں تھے۔ اُن کے کسی مداح اور عقیدت مند نے اُنکی کرامات نہ بیان کیں اور نہ ہی تحریر کیں۔ خود بانو قدسیہ نے بھی اُن کی کرامات کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ تصوف کی نویں خوبی روحانی ارتقاء ہے۔ روحانی ارتقاء کے مختلف مراحل ہیں۔ صوفیاء کرام اپنی روحانی منازل طے کرنے کیلئے سخت وظائف ، سخت جسمانی مشقت، نفس پر کنٹرول کرنے کے لیے محنت و مشقت کرتے تھے۔ دنیاداری ترک کرتے تھے۔ گھریلو زندگی، عہدوں، شہرت، دولت، اقتدار اور اختیارات سے دور بھاگتے تھے۔ عبادات میں مشغول رہتے تھے۔ اشفاق احمد کی زندگی اور معمولات اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ معاملات زندگی سے کنارہ کشی کرنے کے بجائے انہیں بااحسن نبھاتے رہے۔

تصوف کا دسواں اور گیارواں جُز صبر و شکر اور توکل ہے۔ صوفیاء کرام کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ صبر و شکر اور توکل کے پیکر تھے۔ غربت، بیماری، بدنامی، بے سر و سامانی جیسے مشکل حالات بھی اللہ تعالیٰ کی رضا پر خوش تھے۔ اشفاق احمد قناعت پسند تھے مگر زندگی میں انہیں بہت کچھ ملا۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے

تھے۔ ادبی اور پروفیشنل ترقی کیلئے کوشش کرتے۔ اپنے زمانے کے بااثر، طاقتور، خوشحال انسان تھے۔ خود مقتدر طبقات میں شامل تھے۔ بائیسویں گریڈ میں سرکاری آفیسر رہے۔ اس لیے انہیں ایک مکمل صوفی سمجھنا درست نہ ہوگا۔

بانو قدسیہ کی کتاب '' راہ رواں'' پڑھنے کے بعد اشفاق احمد کی جو شخصیت سامنے آتی ہے اُس کے مطابق وہ سخی، دریادل اور دیالو انسان نہیں تھے۔ بلکہ کفایت شعار اور کنجوس انسان تھے۔ کتاب میں بہت سے واقعات اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اشفاق احمد اکثر اوقات دوسروں کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ دوسروں سے فرمائشیں کرتے۔ دوسروں سے تحائف وصول کرتے۔ سخاوت، مہمان نوازی جیسی خصوصیات خان صاحب میں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ ایک صوفی کی اہم خوبی مراقبہ ہے۔ مراقبہ سے مراد ذہنی، نفسیاتی اور روحانی طور پر تنہائی میں آنکھیں بند کر کے حقیقت مطلق (اللہ تعالیٰ) سے تعلق جوڑنا ہے۔ اس کتاب میں اشفاق احمد پر لکھی گئی کسی جگہ کتاب میں مراقبے کا تذکرہ نہیں ملتا۔

تصوف کی آخری خصوصیت شیخ کی اطاعت ہے۔ فنا فی الشیخ ہو جانا ہے۔ رہنما، شیخ اور پیر کے بغیر تصوف نامکمل ہے۔ اشفاق احمد نے باقاعدہ کسی شیخ کی بیعت نہیں کی۔ شیخ کے معاملے میں اشفاق احمد ہر جائیت پسند تھے۔ کبھی بابا فضل شاہ، کبھی سخی رازی، سید سرفراز شاہ اور واصف علی واصف کے رہنما اور پیر رہے۔ صوفیاء کرام کی روایت رہی ہے کہ معرفت اور روحانیت سیکھنے کیلئے سب سے پہلے اپنے مرشد کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ پھر سالہا سال اپنے مرشد کی اطاعت و فرمانبرداری کی جاتی ہے۔ اُس کی جائز و ناجائز بات مانی جاتی ہے۔ اُن کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کیا جاتا۔ مرشد سے سوال کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ شیخ کی مکمل تقلید و پیروی کی جاتی تھی۔ شیخ صاحب جو بھی کام اور ڈیوٹی دیتے تھے۔ اُسے خلوص دل اور نیک نیتی سے سرانجام دیا جاتا تھا۔ اشفاق احمد کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو وہ فنا فی الشیخ جیسی خومعدوم نظر آتی ہے۔

بانو قدسیہ نے ”راہِ رواں“ میں اشفاق احمد کو ہدایت یافتہ صوفی بنا کے پیش کیا ہے جبکہ اشفاق احمد نے صوفی کی جو خصوصیات بتائیں یا اشفاق احمد نے تصوف کا جو نظریہ پیش کیا۔ اُس نظریہ تصوف کو جو اجزاء بتائے۔ اُس معیار اور پیمانے پر اشفاق احمد خود پورا نہیں اُترتے۔ میرے خیال میں اس کتاب میں پیش کردہ معلومات اور نظریات مصدقہ نہیں ہیں۔ بانو قدسیہ نے خود بھی کتاب میں اس بات کا بار بار اعتراف کیا ہے کہ اس کتاب کی معلومات مصدقہ نہیں ہیں۔ میری تحقیق کے مطابق اشفاق احمد صوفی، ولی، درویش، قطب اور ابدال نہیں تھے۔ بلکہ صرف ادیب، دانشور، صداکار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، سفر نامہ نگار، شاعر اور رائٹر تھے۔ سوانح نگاری اردو ادب کی اہم صنف ہے۔ اردو ادب کے پہلے سوانح نگار مولانا الطاف حسین حالی تھے۔ انہوں نے تین مشہور شخصیات کی سوانح عمریاں لکھیں جن میں شیخ سعدی، مرزا اسد اللہ خان غالب اور سر سید احمد خان شامل ہیں۔ اُن کی سوانح عمریاں کے نام یہ ہیں۔ حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید۔ مولانا الطاف حسین حالی شریف الطبع اور منکسر المزاج انسان تھے۔ اُنکی سوانح عمریوں پر بھی اُنکی شخصیت کی چھاپ نظر آتی ہے۔ سوانح عمری کی بنیادی خوبی صداقت اور معروضیت ہے۔ جبکہ داستان، افسانے اور ناول میں مبالغہ آرائی اور موضوعیت ہوتی ہے۔ بانو قدسیہ اپنی کتاب میں صداقت اور معروضیت کی بجائے مبالغہ آرائی اور موضوعیت سے کام لیتی ہیں۔ یہ اس کتاب کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ مصنفہ خود اردو ادب کی اہم ناول نگار اور افسانہ نویس ہیں۔ اس لیے انکی کتاب میں داستانوی انداز، ناول نگاری، افسانہ نگاری اور ڈرامہ نگاری جیسی خصوصیات موجود ہیں۔ میری تحقیق کے مطابق ”راہِ رواں“ سوانح نہیں ہے بلکہ نیم داستانوی انداز کی لکھی گئی کتاب ہے۔ ”راہِ رواں“ کو اگر بانو قدسیہ کی یادداشتیں کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ جس کا مقصد اشفاق احمد کو ہدایت یافتہ صوفی ثابت کرنا ہے۔

اشفاق احمد کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں خاندانی وراثت اور فیملی کا بنیادی کردار ہے۔ مصنفہ اور اشفاق احمد کا خاندان روایتی مسلم خاندان تھا۔ رجعت پسند اور قدامت پسندی کی تمام خصوصیات کا حامل تھا۔ دونوں نے اپنے خاندان کی مرضی کے خلاف، پسند کی شادی کی۔ دونوں اپنی تحریروں میں قدامت پسندی کے حق میں لکھتے رہے۔ دونوں کے زمانے میں اردو ادب کی دو مشہور تحریکیں عروج پر تھیں ایک ترقی پسند تحریک اور دوسرا رومانیت پسند تحریک۔ اشفاق احمد اور

بانو قدسیہ کسی بھی تحریک کا حصہ نہیں بنے۔ بلکہ رجعت پسندی کا مزاج رکھنے کی وجہ سے اقدار و روایات، اخلاق، نیکی، محبت، تصوف، حب الوطنی، پاکستانی، کلچر، اسلامی کلچر جیسے موضوعات پر لکھتے رہے۔ چونکہ یہ موضوعات مسلم معاشرے اور پاکستانی عوام کے محبوب اور پسندیدہ تھے۔ اس لیے ریڈیو، ٹیلی وژن کے ذریعے انہیں بے پناہ شہرت اور مقبولیت ملی۔ بانو قدسیہ مرعوبیت پسند اور تقلید پسند مزاج کی حامل ہیں۔ اس لئے اشفاق احمد اور اُسکے خاندان کی خوبصورتی اور تخلیقی صلاحیتوں سے بے انتہا متاثر ہوئیں۔ تمام کتاب مرعوب خیالات سے بھری ہوئی ہے۔

بانو قدسیہ واقعات کو صحت سے بیان نہ کر سکیں کیونکہ فطرتاً شریف الطبع ہیں۔ شرافت، عاجزی اور بانو قدسیہ کی شخصیت کا لازمی جزو ہیں۔ مصنفہ قناعت پسند ہیں مگر متعدد مقامات پر اشفاق احمد کے ذکر کے ساتھ اپنی ذاتی صفات پر بھی لکھتی رہی ہیں جس سے یہ تصنیف سوانح اور آپ بیتی کی ملی جلی شکل لگنے لگتی ہیں ۔ ''راہِ رواں''میں بہت سی جگہوں پر بانو قدسیہ نے اپنی ان صفات کا اعتراف واضح الفاظ میں کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مصنفہ اشفاق احمد اور اُن کے خاندان کی قصیدہ گوئی کرتی ہیں۔ کتاب کے کسی صفحے یا کسی بھی سطر پر اشفاق احمد اور اُس کی فیملی کی معمولی سی کوتاہی اور کمزوری کا ذکر نہیں ملتا۔ مصنفہ کی شعوری کوشش نظر آتی ہے کہ اشفاق احمد کا خاندان تاریخ میں معزز، تہذیب یافتہ، تعلیم یافتہ اور مثالی خاندان سمجھا جائے۔ یہ کتاب صرف اشفاق احمد کی سوانح نہیں ہے بلکہ اُس کے خاندان کی بھی سوانح ہے۔ کتاب میں اشفاق احمد کے خاندان کا شجرہِ نسب بھی پیش کیا گیا ہے۔ خاندانی رشتوں کی تفاصیل انتہائی طویل اور بُور ہے۔ ان وضاحتوں اور جزیات نگاری کو پڑھ کر اُکتاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ قارئین بیزاری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تمام خاندان تقدس کے ہالے میں لپٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ تخلیقیت اور اخلاص میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ کتاب پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ جیسے نذیر احمد کے ناولوں کے کرداروں کا ذکر ہے۔ روحانیت اور مذہب کا دلدادہ خاندان ہے۔ جبکہ میری تحقیق کے مطابق ایک قدامت پسند اور مادیت پسند خاندان تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی اور بعد بھی خوشحال خاندان تھا۔ دنیاداری اور مادیت کا شوقین خاندان تھا۔ خاندان کے تمام لوگ دنیوی تعلیم کے حصول کے بعد اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ ترقی

اور کامیابی کی منازل طے کرتے رہے۔ڈاکٹر، پروفیسر، انجینئر، ادیب، شاعر اور بیوروکریٹ بنے۔ ان کا مذہب اور روحانیت سے تعلق اتنا گہرا نہ تھا جیسا یہاں دکھایا گیا ہے۔

بانو قدسیہ کے نظریات اور خیالات میں ہی کنفیوژن پائی جاتی ہے۔ ایک طرف بانو قدسیہ قدامت پسند ہیں اور دوسری طرف جدت پسند۔ محبت اور شادی کے متعلق مصنفہ کے خیالات واضح نہیں ہیں۔ مصنفہ پسند کی شادی کی حمایت بھی کرتی ہیں اور مخالفت بھی۔ خود پسند کی شادی کی۔ اشفاق احمد کے خاندان میں جس شخص نے پسند کی شادی کی اُس پہ خوشی کا اظہار کرتی ہیں۔ انکی حوصلہ افزائی اور مدد کرتی ہیں۔ پسند کی شادی اور فرد کی آزادی سے نفرت کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ خود پاکیزہ، معصوم محبت کی قائل ہیں۔ جبکہ قدامت پسند گھرانوں میں محبت کی اجازت نہیں ہوتی۔ مصنفہ کی والدہ رجعت پسند ہیں۔ مخلوط تعلیم، مخلوط محفلوں، محبت اور پسند کی شادی کے سخت خلاف تھیں۔ مصنفہ انکی تعریف کرتی ہیں۔ اُن کے خیالات اور نظریات کو پسند کرتی ہیں۔ محبت کے حق میں بھی ہیں اور مخالفت میں بھی۔ ماضی پسندی کے حوالے سے بھی مصنفہ کے نظریات میں کنفیوژن پائی جاتی ہے۔ انتظار حسین جیسے ماضی پسند ادیب کی تحریروں پر تنقید و اعتراضات بھی کرتی ہیں اور اپنی کتاب میں اپنے ماضی کو موجودہ ماڈرن زمانے سے بہتر بھی تصور کرتی ہیں۔ میری تحقیق کے مطابق مصنفہ، آزادی، محبت، شادی، ماضی پسندی، روایت پسندی اور جدت پسندی کے حوالے سے واضح خیالات کی مالک نہیں ہیں بلکہ اُن کے نظریات میں تضادات پائے جاتے ہیں۔ ان تضادات سے یہ تصنیف قاری کے ذہن میں علمی، فکری سوالات میں مزید اضافہ کرتی ہے۔

"راہِ رواں" میں مبالغہ آرائی، کنفیوژن اور فکری تضادات ہیں۔ کلچر کے موضوع پر بھی بانو قدسیہ بحث کرتی نظر آتی ہیں۔ قدیم کلچر کو ماڈرن کلچر سے بہتر تصور کرتی ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے انقلاب کی وجہ سے جدید گلوبل کلچر وجود میں آیا ہے۔ عالمگیر، آفاقی کلچر دنیا میں وجود میں آیا ہے۔ بانو قدسیہ فکری طور پر سائنسی کلچر کی نقاد ہیں اور زرعی کلچر کو پسند کرتی ہیں۔ مصنفہ کی زبان جدید ہے جس میں انگریزی کے الفاظ جگہ جگہ استعمال ہوئے ہیں۔ زبان کے معاملے میں بانو قدسیہ جدت پسند ہیں جبکہ خیالات کے حوالے سے رجعت پسند ہیں۔ بانو قدسیہ قدیم کلچر کی نشاطِ ثانیہ کی خواہش مند

نظر آتی ہیں۔ اس لئے ترقی پسند ادیبوں، شاعروں اور نقادوں نے اشفاق احمد، بانو قدسیہ کی تحریروں پر سخت تنقید کی ہے۔ انکی تحریروں کو وقتی مقبول ادب قرار دیا ہے۔ بانو قدسیہ گلوکارہ اور اداکارہ بننا چاہتی تھیں لیکن اشفاق احمد اُن کی فیملی اور اپنی فیملی کی رکاوٹ کی وجہ سے نہ بن سکیں۔ اشفاق احمد نے انہیں ادیبہ بننے کی تربیت اور مشورہ دیا۔ اشفاق احمد کے کہنے پر وہ ادب کی طرف مائل ہوئیں۔ بانو قدسیہ نے معاشرتی ارتقاء کیلئے زلزلوں، سیلابوں، جنگوں اور آسمانی مصیبتوں کو لازمی قرار دیا ہے۔ کلچر اور معاشرے کے ارتقاء کیلئے یہ نظریات حیران کن اور عجیب و غریب ہیں۔ جنگوں سے کلچر اور معاشرے پر جمود کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں امن سے معاشرے اور کلچر کا ارتقاء ہوتا ہے۔ اردو ادب میں لکھنو کا کلچر بھی امن کا تحفہ ہے۔ جبکہ بانو قدسیہ نے کلچر کے ارتقاء کیلئے متنازع اور کنفیوز خیالات پیش کیے ہیں۔

بانو قدسیہ کا اسلوب داستانوی اور افسانوی ہے۔ بیانیہ انداز میں کتاب لکھی گئی ہے۔ چند صفحات کو چھوڑ کر ”راہِ رواں“ دلچسپ اور رواں اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ اگرچہ "راہِ رواں "سوانح کے فن سے مطابقت نہیں رکھتی لیکن اس میں مکالمہ نگاری اور جزیات نگاری، خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔ داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج کتاب کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ جذبات نگاری بھی متوازن انداز میں کی گئی ہے۔ زبان و بیان کے حوالے سے بھی کتاب بہتر انداز میں لکھی گئی ہے۔

اگر ” راہِ رواں“ کی فنی خامیوں کا ذکر کیا جائے تو پلاٹ انتہائی کمزور اور ڈھیلا ڈھالا ہے۔ کردار نگاری اعلیٰ پائے کی نظر نہیں آئی۔ کوئی بھی خاکہ نگاری اور شخصیت نگاری کے حوالے سے فنی اصول و قواعد کا خیال نہیں رکھا گیا۔ کتاب سوانح عمری ہے۔ لیکن سوانح کے اصولوں کو پوری طرح نہیں برتا گیا۔

بانو قدسیہ کی تصانیف درج ذیل ہیں۔ ”راجہ گدھ“، ”شہر بے مثال“، ”توجہ کی طالب“، ”چہار چمن“، ”سدھراں“، ”آسے پاسے“، ”دوسرا قدم“، ”آدھی بات“، ”دست بستہ“، ”حوالے کے نام“، ”سورج مکھی“، ”پیا نام کا دیا“، ”آتش زیر پا“، ” امر بیل“، ”بازگشت“، ”مرد ابریشم “، ”سامانِ وجود“، ”ایک دن“، ”پروا “، ”موم کی گلیاں“،

’’لگن اپنی اپنی‘‘،’’ تماثیل‘‘،’’فٹ پاتھ کی گھاس‘‘،’’دوسرا دروازہ‘‘،’’ناقابلِ ذکر‘‘،’’کچھ اور نہیں‘‘،’’حاصل گھاٹ‘‘، ’’پھر اچانک یوں ہوا‘‘،’’چھوٹے شہر بڑے لوگ‘‘،’’راہِ رواں‘‘،’’ہجرتوں کے درمیان‘‘مصنفہ کی ان تمام تصانیف کا ادبی مقام ومرتبہ متعین کیا جائے، ان کا فنی و فکری جائزہ لیا جائے۔تو’’ راہِ رواں‘‘،ادبی، فنی اور فکری حوالے سے دوسری تمام تصانیف کے مقابلے میں ایک کمزور تصنیف قرار دی جاسکتی ہے جو نہ تو سوانح کے فن پر پوری اُترتی ہے نہ آپ بیتی ہے۔

بانو قدسیہ کی بہترین کتاب’’ راجہ گدھ‘‘ ہے اور اس کے مقابلے میں "راہِ رواں" اتنی جاندار اس لیے نظر نہیں آتی کہ اسے سوانح کے فن پر جانچا جاتا ہے۔ اگر اسے سوانح کے بجائے بانو قدسیہ کی یادداشتیں سمجھا جائے تو اس میں اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی زندگی کی اہم یادیں موجود ہیں جو ان کے حوالے سے بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔عام قارئین کیلئے اس کتاب میں دلچسپی، حیرت، اخلاقیات، تصوف، مذہب، حب الوطنی جیسی خصوصیات وافر مقدار میں موجود ہیں۔انکی روحانی، ذہنی، نفسیاتی اور دلی تسکین کیلئے مافوق الفطرت واقعات موجود ہیں۔ مقبولِ عام ادب کے قاری کے لیے یہ تصنیف اپنے اندر دلچسپی کا سامان لیے ہوئے ہے مگر ایک محقق کی حیثیت سے اگر اس تصنیف کا جائزہ لیں تو یہ داستان، افسانہ، ناول، ڈراما سوانح اور آپ بیتی جیسی تمام اصناف کی خصوصیات سے مل کر ایک ملغوبہ بن کر سامنے آتی ہیں۔واقعات کی صحت کو نظر انداز کر دیا جائے تو بانو قدسیہ کا ناصحانہ انداز اور زبان پر گرفت ایک عام قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہیں۔ بانو قدسیہ نے اپنے وسیع مطالعے سے اکثر مقامات کو قاری کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز بنایا ہے لیکن اس تصنیف کا اصل مقصد وہاں فوت ہوتا دکھائی دیتا ہے جہاں واقعات کی صحت کمزور نظر آتی ہے۔

نتائج

''راہِ رواں'' بانو قدسیہ کی تصنیف ہے جسے اشفاق احمد کی سوانح بھی کہا جاتا ہے۔ ''راہِ رواں'' کے فکری اور فنی پہلوؤں پر تفصیلی بات کرنے کے بعد درج ذیل نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

۱۔ ''راہِ رواں'' میں سوانح سے زیادہ آپ بیتی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اشفاق احمد کے ساتھ ساتھ بانو قدسیہ کی شخصیت بھی اس میں غالب نظر آتی ہے۔

۲۔ ''راہِ رواں'' کا فکری پہلو فنی پہلو کی نسبت کمزور ہے۔

۳۔ ''راہِ رواں'' میں پیش کیے گئے واقعات کی صحت مشکوک ہے جس کا اظہار بانو قدسیہ نے خود کیا ہے۔

۴۔ ''راہِ رواں'' کے فلیپ پر یا کتاب کے اندر کتاب کے بارے میں کسی قسم کا کوئی تبصرہ یا رائے وجود نہیں ہے۔

۵۔ ''راہِ رواں'' کا فنی حوالہ خاصا مضبوط نظر آتا ہے اور اس تصنیف کا جاندار پہلو ہے۔

۶۔ طرزِ تحریر کے حوالے سے ''راہِ رواں'' ناول، افسانہ اور داستان سے قریب لگتی ہے۔

۷۔ بانو قدسیہ نے خود کو ایک ناصح کے روپ میں پیش کیا ہے بعض اوقات معمولی سی بات کے لیے لمبی تمہید باندھتی ہیں اور اُس میں بھی نصیحتیں شامل ہوتی ہیں۔

۸۔ ''راہِ رواں'' میں مکالمہ نگاری، کردار نگاری، جزئیات نگاری جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن میں جزئیات نگاری سب سے اہم ہے۔

سفارشات

1۔ "راہِ رواں" بانو قدسیہ کی تحریر ہے اور "بابا صاحباں" اشفاق احمد کی، دونوں میں اشفاق احمد کی شخصیت کو موضوع بنایا گیا ہے ان دونوں تصانیف کا تقابل کر کے واقعات کی صحت کی جانچ کی جانی چاہیے۔

2۔ "راہِ رواں" سوانح عمری ہے اس سوانح عمری کا دیگر سوانح عمریوں سے تقابل کر کے سوانح کے فن کے حوالے سے "راہِ رواں" کا تجزیہ کیا جانا چاہیے۔

کتابیات

۱۔ اعجاز حسین سید، ڈاکٹر "مختصر تاریخ ادب اردو" اردو اکیڈمی سندھ کراچی تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۱ء

۲۔ الطاف فاطمہ، "اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا" اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی پہلا ایڈیشن ۱۹۷۴ء

۳۔ امیر اللہ خان شاہین، ڈاکٹر، "فن سوانح نگاری"، طاہر بک ایجنسی دہلی ۱۹۷۳ء

۴۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر، مرتبہ ابو الا عجاز حفیظ صدیقی، "کشافِ تنقیدی اصطلاحات"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵

۵۔ بانو قدسیہ، "راہِ رواں"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱

۶۔ ج۔ع۔ واجد، "فرہنگ ادبیات اردو" ایس ایچ آفسیٹ پرنٹرس دہلی، دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۱ء

۷۔ راشد فیصل ملک، "حالی کی سوانح نگاری" ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۷ء

۸۔ رفیع الدین ہاشمی، "اصناف ادب" سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۲ء

۹۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر "تفہیم و تجزیہ" کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ جامع پنجاب، لاہور، ۱۹۹۹ء

۱۰۔ شاہ علی سید، ڈاکٹر "اردو میں سوانح نگاری" انجمن پریس لارنس روڈ، کراچی ۱۹۶۱ء

۱۱۔ صبیحہ انور، ڈاکٹر، "اردو میں خود نوشت سوانح حیات" نامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۲ء

۱۲۔ صدف نقوی، "گوہر ادب" مثال پبلشرز امین پور بازار، فیصل آباد، اشاعت دوم، ۲۰۱۵ء

۱۳۔ عبد الحق، "مولوی"، ڈاکٹر، بابائے اردو "انجمن کی اردو انگریزی لغت" انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، طبع چہارم، ۱۹۸۷ء

۱۴۔ عبد القیوم، ڈاکٹر، "سوانح نگاری کیا ہے" مشمولہ "اردو نثر کا فنی ارتقا" مرتب ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ۱۹۹۷ء

۱۵۔ عبد القیوم، ڈاکٹر، "تنقیدی نقوش" مشتاق بک ڈپو، کراچی

۱۶۔ فیروز الدین، مولوی، الحاج "فیروز اللغات" فیروز سنز لاہور، بار اول ۲۰۱۰ء

۱۷۔ گیان چند، ڈاکٹر، "ادبی اصناف" گجرات اردو اکادمی گاندھی نگر پہلا ایڈیشن ۱۹۸۹ء

۱۸۔ مظہر مہدی، "بیسویں صدی میں اردو کا سوانحی ادب"، مشمولہ، "بیسویں صدی میں اردو ادب" مرتب گوپی چند نارنگ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء

۱۹۔ مقبول بیگ بدخشانی، مرزا "اردو لغت" اردو سائنس بورڈ، لاہور، بار دوم، ۱۹۸۸ء

۲۰۔ ممتاز فاخرہ، ڈاکٹر "اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا" (۱۹۱۴ تا ۱۹۷۵) رونق پبلشنگ ہاؤس دہلی، پہلا ایڈیشن ۱۹۸۴

۲۱۔ منصف خان سحاب، "نگارستان" مکتبہ جمال لاہور ۲۰۱۰ء

۲۲۔ ممتاز مفتی، "اور اوکھے لوگ"، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۵۱

۲۳۔ نجیب رامپوری، "نئی اردو لغت" (جامع)، فرید بک ڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ، ۲۰۰۴

۲۴۔ وہاج الدین علوی، "اردو خود نوشت فن و تجزیہ" جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ۱۹۸۹ء

رسالہ

۱۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، "اردو سوانح نگاری" مشمولہ "خیابان" اصناف نثر نمبر شعبہ اردو جامعہ پشاور، ۱۹۹۵ء

انٹرویو

۱۔ راقمہ کا ڈاکٹر اقلیمہ ناز سے بذریعہ ٹیلی فون انٹرویو، ۱۵/ اگست ۲۰۱۸ء

ویب سائٹ

۱۔ www.jahan-e-urdu.com